سلسلۂ مطبوعات کتب اسلامیہ (۹)
McGill University Library
3 102 872 785 Y
مطالعات
اسلامی
تالیف
حسن واصف عثمانی
کتب خانہ اسلامیہ الہ آباد

سلسلۂ مطبوعات کتب اسلامیہ (۹)
مطالعۂ اسلامیات
تالیف
حسن واصف عثمانی
کتب خانہ اسلامیہ الہ آباد

ترتیب

ایک
وحدت کے
چند اہم اجزاء
کی
ارتقائی تاریخ

○

سرورق

اسلامی فن تعمیر کے بے مثل نمونے الحمرا کا ایک
گوشہ یہ دوسری منزل کی ایک شہ نشین کی تصویر ہے
الحمرا کو اندلس کے اموی حکمرانوں نے ۱۲۴۸ء
میں بنانا شروع کیا اور ۱۳۵۴ء میں تعمیر مکمل ہو سکی۔

رنگ آمیزی

تصویر میں اصل عمارت کی پچی کاری کے مطابق
رنگ دیے گئے ہیں!

کتابت
سلیم اللہ نیر رقم
ڈسٹ کور
معشوق احمد صدیقی
سرورق اندرونی
حسن پرویز الٰہ آبادی
حسن انتظام
امان اللہ

باہتمام عبدالمجید صاحب

اسرار کریمی پریس جانشین گنج

الٰہ آباد-۳

سولہ ربیع الاول مطابق ۲۔ جولائی ۶۲۲ء یثرب کے شہر نے صبح سویرے محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے ورود مسعود پر خدائے واحد کا شکر کیا اور گواہی دی کہ اللہ ایک
ہے اور محمد اس کے رسول ہیں

روحی فداک

اسی دن سے مدینۃ النبی: یثرب میں وہ معاشرہ قائم ہونے لگا جو طریقۂ فکر' نظام حیات' قانون اور حسیات و جذبات کے اعتبار سے سارے عرب' ساری دنیا سے الگ' بلند اور نرالا تھا۔ محمد الرسول اللہ نے مدینے میں ایک ریاست کی بنیاد رکھی ایک معاشرہ قائم کیا۔ ایک امت الوسطیٰ کی تعمیر کی۔ توحید اسکا ایمان، رسالت اسکی رہنما' شریعت اسکی حکمراں تھی۔ معاشرت و معاشیات، سیاست و اجتماعیات اخلاق و ضمیر ہر چیز کے نئے انفرادی اور اجتماعی ضوابط و معیار مقرر کئے گئے بارہ ربیع الاول سنہ گیارہ ہجری مطابق ۸ جون ۶۳۲ء کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اپنے پاس واپس بلا لیا۔ اس وقت تک اسلام کامل ہو چکا تھا اور مدینہ کی شہری ریاست سارے عرب کا ذہنی اور روحانی مرکز بن چکی تھی۔

ساڑھے تیرہ صدیوں سے
مدینہ کی ریاست کے مرکز سے پھوٹنی والی شعاعیں کرۂ ارضی کے کونے کونے پر پڑ رہی ہیں۔ اسلام کی تہذیب وسلطنت نے دنیا کی تاریخ کا دھارا سرسبز زمینوں کی طرف موڑا ہے ارتقار کی رفتار تیز کی ہے۔ اندھیرے میں علم وعمل کی مشعلیں روشن رکھی ہیں۔ مساوات اور یکرنگی کے لئے بے انتہا جدوجہد کی ہے۔ دنیا کو سنوارنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا ہے

مطالعہ اسلامیات

اسی دین کامل کی وحدت کے چند اہم اجزار کا جائزہ ہے۔ اسلام کے ہمہ گیر نظام فکر سے واقفیت کے علاوہ ان اجزار کے اپنے مرکز سے تعلق کی تشریح مؤلف کا مقصد ہے اور یہ ایک بے مایہ قلم سے ان تمام جلیل وجمیل افراد کی ذہنی توانائیوں کی داستان بیان کرتی ہے جنھوں نے اسلام پر ایمان رکھا، اسکی حفاظت میں تلوار اور قلم اٹھائے اور اپنے دین مقدس کی خاطر خون، پسینہ، محنت، ہر چیز کی قربانی دی۔ وہی ہمارے ماضی کا سب سے روشن باب ہیں۔

والسّلام علیٰ من تبع الھدیٰ

سلطنت و تہذیب

کا

عروج

اسلام ایک دین کامل ہے اسکے تمام اجزا باہم پیوستہ ہیں۔ عقاید، طرز حیات اور قانون کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ ایک وحدت کے اجزار کا مطالعہ ہے۔ عالمی تاریخ و تہذیب کو اسلام نے بہت کچھ سنوارا اور بنایا ہے، دنیا کو بہت کچھ دیا ہے۔ مشرقی ملکوں کی ساری علمی وراثت اسلام کا عطیہ ہے اور مغرب کو عہد ظلمات کی تاریکی سے صنعتی زمانے میں لانے کا کام مسلمانوں نے انجام دیا ہے۔ تہذیب کے ارتقا میں عرب کے حسن طبیعت اور عجم کے سوز دروں کو کوئی نظر انداز نہیں کرتا اور یہ دونوں اسلام کے دین کامل کی آغوش میں پلے بڑھے تھے۔

مغرب نے عربوں سے روشنی لی جن کا حسن طبیعت ایشیا اور افریقہ کو سنوارتا رہا، اُندلس میں منارۂ نور بنا، عربوں نے میدان علم میں مشاہدے اور استقرار کو رائج کیا، علم و شعور کی دولت عام کی، ایک جگہ کے معلومات کو دوسری جگہ لے گئے، ایسا فن تعمیر ایجاد کیا کہ جس میں جلال و جمال پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھے اور دنیا میں پہلی بار ادارۂ ریاست کو رعیت کی فلاح کا ذریعہ اور جماعت بشری کی اجتماعی آرزوں، خواہشوں اور تمناؤں کا آلہ کار قرار دیکر جمہوریت کی بنیاد رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب نے ہر چیز عربوں سے لی

جو دین اسلام کے پیرو تھے۔

پھر عجم کے سوز دروں کا زمانہ آتا ہے اس میں مشرقی ملکوں نے اکتساب رنگ و نور کیا، فکر جمیل اور فنون لطیفہ کے ان کارناموں کی داغ بیل پڑی جس سے ادب عالیہ نے جنم لیا اور ایشیائی قوموں نے استقلال حیات حاصل کیا۔ ہند و ایران کی قدیم سرزمین پر نئی روشنی پھیلی، ایشیائی ممالک ابتدائی تمدن کی پست سطح سے اُٹھ کے بلند تر تہذیب کی رفعتوں پر آ رہے۔

آج کی دنیا جیسی کچھ بھی ہو، عرب کے حسن طبیعت اور عجم کے سوز دروں کو سمجھے بغیر اسکو سمجھنا ممکن نہیں، اور یہ دونوں چیزیں اسلام کو سمجھے بغیر سمجھ میں نہیں آتیں کیونکہ انکے پس پشت اسلام کی توانائی کارفرما تھی۔

یہی مطالعہ اسلامیات کی اہمیت ہے۔

○

عرصہ دراز سے اسلام کے بارے میں جان بوجھ کر غلط فہمیاں پھیلائی جاتی رہی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب نہیں، بلکہ عرب کے صحرا کی مقامی پیداوار، اور صحرا کا مذہبِ خاص ہے۔ اس سلسلے میں علمی حلقوں کو اس نظریے نے زیادہ متاثر کر رکھا تھا کہ بانیٔ اسلام، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی یکتائی، بزرگی اور وسیع معانی میں توحید پر جو زور دیا ہے وہ عرب کے نہ بدلنے والے، قدیم و عظیم صحراؤں کی فضا میں انسانی ذہن پر پڑنے والا اثر اور اسکا نتیجہ تھا، اسلام ابتدا میں عربی رنگ، مقامی فضا اور ماحول کے رنگ میں بلاشبہ ڈوبا ہوا تھا اور اسکے اثرات اب تک اسلام پر

باقی ہیں۔ مگر اسکی وجہ اب علمی حلقوں کے نزدیک وہ ذہنی بنیاد ہے جو اسلامی تمدن و تہذیب کو قرآن کے آفریدہ فکر و نظر، طرز حیات، قانون اور معیار اخلاق نے عطا کی تھی لیکن قرآن وقت و زمانے سے بالاتر ہے۔

بانی اسلام نے آخر جس لفظ "اسلام" کو اپنے پیغام کے لئے اختیار کیا اُسکے معنی تسلیم یعنی "اپنے نفس کو خدا کی رضا میں دینا" ہیں۔ اسلام کے ساتھ مسلم: مسلمان کی اصطلاح کو بھی سمجھنا چاہیئے۔ ان کے معنی اس فرد کے ہیں جس نے اپنے آپ کو رضائے خداوندی کے لئے وقف کر دیا ہو۔ یورپ میں عرصہ دراز تک عام طور پر اور اب بھی مسلمانوں کو اور انکے مذہب کو دین محمدی کہا جاتا ہے اور یہ ناروا ہے۔ کیونکہ اسلام شرکت کی اجازت نہیں دیتا، مسلمان اپنے پیغمبر کی پرستش نہیں کرتے انکے لئے خدا کے سوا کسی کی پرستش ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ اسلام کا بنیادی کلمہ طیبہ کہتا ہے۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

"سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں، محمد اس کے رسول ہیں۔"

کلمہ طیبہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک رسول کہا گیا ہے، یہی عقیدہ مسلمانوں کا ہے وہ انکو دوسرے رسولوں آدم، نوح، ابراہیم، یعقوب، یوسف، اسحاق و اسمٰعیل موسیٰ اور مسیح علیہم السلام کی طرح ایک رسول کہتے ہیں لیکن ان کو سب سے بڑے رسالت کا سلسلہ ختم کرنے والے ہادی برحق کا رتبہ دیتے ہیں جو قانون خداوندی کو انسانیت کے لئے مکمل اور آخری صورت میں لائے تھے۔ اسلام شریعت کو زندگی گزارنے کا قطعی اور آخری معیار تسلیم کرتا ہے جو اُس وقت تک کے لئے ہے جب تک یہ کرۂ زمین نیست و نابود نہ ہو جائے۔

ان عقاید کو تسلیم کئے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا نہ عالمگیر ملت اسلامیہ کا فرد و حصہ بن سکتا ہے۔ توحید، رسالت اور شریعت پر ایمان اسلامی عقاید کی بنیاد ہیں۔

○

گو اسلام کے ان عقاید کی اشاعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مکی زندگی میں ہی شروع کردی تھی۔ مگر یہ اپنی پوری قوت سے ۶۲۲ء میں ظاہر ہوئے، جب ہجرت کے بعد وہ مدینہ تشریف لائے، دس سال کے بعد بانی اسلام نے وفات پائی لیکن ان دس سالوں میں آپ یہ واضح کر چکے تھے کہ اسلام صرف چند نجی مذہبی عقاید کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسے مکمل معاشرے کے قیام کا نام ہے جسکے اپنے طرزِ حیات، طریقۂ فکر، قانون اور حکومت کے معیار ہوں، ہجرت کی اس اہمیت کو کہ اس سے اسلام کی تاریخ میں سب سے بڑا موڑ آیا ہے قرن اول کے مسلمانوں ہی نے محسوس و معلوم کرلیا تھا اور اسی لئے اسلامی سنہ کا آغاز ۶۲۲ء سے کیا گیا ہے۔

اس نئے معاشرے نے اپنی مضبوط اور باصلاحیت حکومت کے ذریعے، جسکی رعیت اور لشکروں کو اسلام نے سرمست و سرگرم بنا دیا تھا، بہت جلد جزیرۂ عرب پر تسلط پالیا اور پھر نئی زمینوں پر توجہ کی۔ بانی اسلام کی وفات کے بعد کچھ دنوں تک وقتی کمزوری آئی اور پھر فوراً فتوحات کا سیلاب مغربی اور شمالی افریقہ پر چھا گیا، ہمسایہ بازنطینی سامراج کے اگلے حصے فلسطین و اردن پر اور ہمسایہ ایرانی سامراج کے اگلے حصے جنوبی عراق کو اپنی گرفت میں لے آیا۔ ان دونوں قدیم اور عظیم سامراجی سلطنتوں کو جو باہمی آویزش کی بناء پر مضمحل و ناکارہ ہو چکی تھیں یکے بعد دیگرے اسلام کے لشکروں نے دو کامیاب اور منظم فوجی مہمات میں شکست فاش دیکے مٹا دیا۔ قادسیہ اور یرموک کی جنگ میں روم

وایران کے سامراج مٹ گئے۔ بانیٔ اسلام کی وفات کے چھ سال بعد ہی سارے عراق وشام نے مدینہ کو خراج دینا شروع کیا۔ اور چار سال بعد مصر بھی نئی مسلم سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔

یہ زبردست فتوحات آنے والی صدی میں مزید ایسی حیرت انگیز توسیعات کا آغاز تھیں۔ جو عربوں کو مراکش، اندلوسیہ، فرانس، قسطنطنیہ کے دروازوں، وسط ایشیا کے برف زاروں اور دریائے سندھ تک لے گئیں۔ اور اسلام کے کردار کو ایک مضبوط، خود اعتماد اور فاتح عقیدے کا نمونہ بنا گئیں۔ اسی کامیابی نے اسلام کے اس رویہ کو جنم دیا کہ یہ کسی ایسی چیز کو برداشت نہیں کرتا جو اسکے اپنے دائرے کے باہر ہو اور ساتھ ساتھ اس نے اسلام کو اپنوں سے بہت زیادہ نرمی برتنا، غیروں کے عقاید کا احترام کرنا اور ان سے رواداری کا سلوک کرنا سکھایا اور یاس و زوال کے زمانے میں صبر و تحمل سے اپنے وقار اور عقیدے کی حفاظت کا سبق دیا۔

لیکن غیر معمولی فتوحات سے زیادہ اچنبھے میں ڈالنے والی بات اسلام کی ضابطہ پسندی اور نظم و ترتیب ہے۔ جنگ کے زمانے میں تھوڑی بہت تباہیاں تو لازمی تھیں۔ مگر عربوں نے دوسرے فاتحوں کی طرح اپنے پیچھے پیچھے صرف تباہیوں کے آثار نہیں چھوڑے بلکہ انھوں نے تہذیبوں اور آبادیوں کے امتزاج اور ترکیب کا ایک نیا سلسلہ قائم کیا۔ بانیٔ اسلام نے قانون اور حکومت کا جو سانچہ اپنے جانشینوں، خلفائے راشدین کو عطا فرمایا تھا۔ وہ پہلے عرب کے قبائل کو متحد و متمدن کرنے میں پوری طرح کامیاب رہا اور اسکے بعد اسلام اپنے مفتوحہ متمدن علاقوں میں ایک ایسے طرز حیات کی صورت میں پھیلا جو اپنی اخلاقی قوت سے انسانوں کو اپنے احترام پر مجبور کرتا تھا اور

اپنے باقاعدہ طرزِ فکر کی بنا پر بازنطینی عیسائیت اور ایرانی آتش پرستی سے بہت بلند و برتر تھا یہ تو واقعہ ہے کہ قبائلی عصبیت، وحشیانہ جذبے اور قبائل عرب کی پرانی جاہلیت کا ظہور مقامی بغاوتوں اور خانہ جنگیوں میں ہوتا رہا لیکن ان کا اثر یہ ہوا کہ اسلام کی نئی سلطنت کو مستحکم و منظم کرنے کے عام عزم و ارادے اور طاقت پاتے گئے۔

○

مفتوحہ علاقوں کے عوام کے لئے اسلام کی فتح شروع شروع میں محض آقاؤں کی تبدیلی معلوم ہوتی تھی ان کی زندگی اور سماجی روایتوں کے سلسلے کو کسی نے نہیں چھیڑا ان پر کوئی جبر نہیں کیا گیا نہ کسی کو زور زبردستی سے مذہب و زبان بدلنے پر مجبور کیا گیا۔ مگر رفتہ رفتہ مشرقِ وسطیٰ اور مصر کے سماجی ڈھانچے کو اسلام نے بدلنا شروع کر دیا خود عرب عناصر ملت میں تبدیلیاں آنے لگیں اور عرب عناصر نے قدیم یونانی اور ایرانی تہذیب کے بطن میں اپنے اثرات جما ڈالے۔ ان نئے مفتوحہ علاقوں میں عربوں نے جو بستیاں بسائی تھیں (مثلاً کوفہ، بصرہ، فسطاط، دمشق، بغداد، قیرواں) وہ صرف فوجی چھاؤنیاں اور جنگی اہمیت کے شہر ہی نہ تھے بلکہ ایسے شہر بھی تھے جہاں سے اسلام کی تبلیغ نظریہ اور عمل کے اعتبار سے کی جاتی تھی باجگزار خطوں اور علاقوں کی دولت سے مالامال ہو کے اور نومسلموں کی مسلسل کثیر تعداد کے شامل ہونے سے طاقت پا کے یہ بستیاں نئی اسلامی تہذیب کے محور و مرکز بن گئیں۔

○

۶۶۱ء میں بھی عرب سلطنت کا مرکز دمشق بن چکا تھا۔ اس قدیم شہر کو خلفائے بنو اُمیہ نے اپنا مسکن بنایا۔ اب بھی مدینہ علوم اسلامیہ کا مرکز تھا لیکن دمشق حکومت

اور عوامی زندگی کے سر رشتوں کا مالک ہو گیا تھا۔ یہاں سے طرز حکومت اور طرز فکر پر پہلا نمایاں اثر قدیم بازنطینی سلطنت کا پڑا اور یونانی فلسفے، طرز تعمیر اور طب سے مسلمان روشناس ہوئے اس عہد کی یادگار دمشق کی جامع اموی کی حسین و وسیع عمارت اور بیت المقدس میں قبتہ الصخرا ہیں ان یونانی تعلقات نے نئے علاقوں میں تشکیک وار نیاب کا آغاز کیا۔ نئے نئے فرقے قائم ہوئے۔ خلفائے بنو اُمیّہ نے عربیت اور اسلام کے خالص معیار کی سلامتی کے لئے سرگرم جدوجہد کی۔ علوم اسلامیہ کی باقاعدہ بنا پڑی اور خلفائے اموی نے ان کی سرپرستی کی۔

○

اسلام نے سماجی اور ذہنی ارتقاء کے بڑے مرحلے پہلی صدی ہجری میں ہی کامیابی سے طے کر لئے تھے، اس ارتقار کا آغاز بانی اسلام کی مبارک و مقدس شخصیت سے ہوا اور اس کو نشوونما ان کے خلفائے راشدین اور صحابہ کرام نے عطا کی۔ بانی اسلام کی تعلیم و تربیت نے سرزمین عرب کو روحانیت، اخلاق اور ذہنی قوت سے آراستہ کر دیا۔ جس کی وجہ سے پہلی صدی ہجری ہی میں اسلامی تہذیب پوری طرح پھل پھول چکی تھی خلفائے راشدین اور صحابہ کرام نے عربوں کو اسلام کے صراط مستقیم پر گامزن رکھا اور جب قدیم تہذیبوں اور پیچیدہ طرز حیات سے مسلمانوں کا سابقہ پڑا تو اسلام پر ان کی قدامت و کہنگی بھی اثر نہ ڈال سکی بلکہ وہ اپنے پاک و صاف سرچشمہ سے دور دور کی زمینوں تک بہ کے حسب دستور سارے عالم کو سیراب کرتا رہا۔

صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں جو علم و فضل اسلامی تہذیب کو ملا وہ دینی رنگ سے رنگا ہوا تھا۔ ایسے علوم کا آغاز ہوا جو اس سے قبل عرب میں

ناپید تھے۔ مثلاً قرآنی علوم: حفظ، کتابت، قرأت اور قرآن سے اصول احکام کا استخراج جس نے اس بڑے وسیع قانون کی بنیاد رکھی، جو بعد میں فقہ اسلام کے نام سے مشہور ہوا علم حدیث نے ایک وسیع شعبۂ علم کی صورت اختیار کی جس میں احادیث رسول کا یاد رکھنا ان کا سلسلۂ سند محفوظ رکھنا، راویوں کے بارے میں تحقیق (الرجال) اور احادیث کا معاملات پر اطلاق شامل ہے۔ عربی لسانیات بھی باقاعدہ طور پر پڑھی پڑھائی جانے لگی کیونکہ قرآن وحدیث کے الفاظ ومحاورات کی تحقیق کے لئے ادب وانشار سے واقفیت ضروری تھی اسکی وجہ سے اب عرب میں شعر وادب، لغات وانشار پر علمی تحقیق ہونے لگی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، آپکے غزوات اور سیرت پر توجہ نے تاریخ وسوانح نگاری کے فن کو جلا بخشی سو سال کے عرصہ قلیل میں یثرب نے مدینۂ رسول ہوکے ایسی علمی ترقی کی کہ علم وفضل کا مرکز بن گیا اور سارے عرب میں ایک علمی انقلاب آگیا۔

پہلی صدی میں یہ ارتقار سارے کا سارا صرف عربوں کا رہین منت ہے اور یہ وہ قوم تھی جو سو سال پہلے علم وفضل کی ان ترقیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن اسلام کی آمد نے اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھدی تو یہی عرب صاحب السیف وقلم بن گئے اور مدینۃ الرسول میں ہر مسجد ہر گھر ایک جامعہ علم بن گئی۔

○

عربوں کی یہ ترقی خلفائے راشدین، تابعین، تبع تابعین کے عہد کی آفریدہ تھی۔ اس میں خالص اسلام کے رنگ وبو تھے۔ عالمگیر انسانیت، مساوات، خدا پرستی اور انفرادی طور پر نیک روشنی کی یہ صدی، خلافت پر بادشاہت کے رنگ چڑھنے اور غیر اسلامی طرز زندگی کے آغاز پر ختم ہوئی، جب مدینۃ الرسول سے اسلام کی حکومت کا

مرکز پہلے کوفہ پھر دمشق کو منتقل ہوا یہاں آ کے خلافت اموی کو نظم و نسق، مالیات اور غیر ملکی تجارت کے شعبوں میں ایسے طریقوں سے سابقہ پڑا جو غیر عرب روایات کے پروردہ تھے ایک بڑی پیچیدہ مشین کی طرح اب خلافت اموی کا ڈھانچہ بہت بڑا ہو گیا تھا سیدھی سادی قبائلی زندگی کی جگہ تمدن نے لے لی تھی۔ بڑے شہروں میں ایک نئی تہذیب کا جنم ہوا جسکی روح اور مزاج تو عرب اور اسلامی سادگی سے مستعار تھے لیکن اس کے ظاہر پر بازنطینی اور ایرانی تمدن کا نمایاں اثر تھا۔ یہ دونوں تمدن ارتقا کے آخری مرحلوں میں آ کے اب دم توڑ چکے تھے مگر ان کی روایات کا سرمایہ زندہ تھا اور اموی خلافت کے زمانے میں اس شہری تمدن و تہذیب کے بہت سے آثار مسلمانوں نے قبول کر لئے گو عقاید و شریعت کے بارے میں ذرہ برابر بھی مصالحت پسندی گوارا نہ کی گئی۔ بنو امیہ کا زمانہ مذہبی عقاید کی پاسداری اور عام معاملات میں نئے طریقوں کے رواج کا بہترین زمانہ ہے، انھوں نے وہ لچک جائز رکھی جو اسلام کے عقاید و بنیادوں سے متصادم نہ تھی۔

○

پھر خلفائے بنو عباس نے ۷۶۲ء میں بغداد کو مرکز بنایا اب فتوحات کا اصل زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ بیرونی توسیع کی جگہ اندرونی وسعت پذیری نے لے لی۔ اسلامی تمدن و تہذیب کو یہ چند صدیاں اسلامی آثار و علوم کے عروج اور تخلیقی قوت کے انتہا کی ملی ہیں۔ صنعت و حرفت، تجارت، فن تعمیر، اور صدہا فنون و علوم بڑی شدت سے نمود و ارتقا کی شاہراہوں پر بڑھے اور عراق، شام، اور مصر نے اپنا اپنا حصہ اسکے مشترکہ سرمایہ میں شامل کیا ان نئی توانائیوں نے ذہنی زندگی میں بھی اپنا اثر دکھایا

ایک طرف تو علوم اسلامیہ سمرقند سے قرطبہ تک بے شمار نئے نئے مرکزوں میں پھل پھول رہے تھے دوسری طرف شعروادب اور فکرو منطق نے یونان، ایران اور ہندوستان کی روایات سے اپنا سلسلہ ملادیا اور آزادانہ طور پر بلکہ اس طرح پروان چڑھنے لگے کہ کبھی کبھی ان کی مسلم روایات و عقاید سے ٹکر بھی ہوجاتی تھی۔ اس زمانے میں مادی و روحانی زندگی پورے عروج پر تھی اور ذہنی توانائی کے کام جاری تھے۔

اس ہمہ جہتی ذہنی ترقی کے اثرات و نتایج پر مختصر تبصرہ ناممکن ہے۔ قدیم زمانے کے خالص اسلامی و عربی علم، مثلاً: لغت و انشار، انساب، شعرو شاعری اور ادب میں عام تاریخ اور قصے کہانیاں بھی داخل ہوگئیں۔ یونان کے طبی اور ریاضیاتی علوم کا بے شمار کتابوں کے ذریعے ترجمہ کرکے ان کو عام کردیا گیا تھا بعد میں انکو عرب اور ایران کے سائنس دانوں نے خصوصیت سے الجبرے، مثلثات، اور بصریات کے شعبوں میں ترقی دے کے آگے بڑھایا، جغرافیہ جسکو کسی تہذیب کے ذہن کے ارتقا کا جائزہ لینے کے لئے بہترین ذریعہ مانا جاتا رہا ہے عربوں اور مسلمانوں کے تحت غیر معمولی ترقی کرگیا اور اپنے تمام شعبوں، سیاسی، معدنی، ریاضیاتی، فلکیاتی، طبعی تقسیم اور مشاہدے و تحقیق میں اتنے اونچے مقام پر پہونچا کہ اقوام عالم اور طبقات زمین کے ہر حصے کو محیط کرلیا۔ یہی حال تاریخ کے علم کا تھا۔

○

یونانی علوم کے ان اثرات و نتایج نے اسلامی تہذیب کے صرف ظاہر پر ہلکا سا اثر کیا تھا لیکن یونانی فلسفے اور منطق نے تیسری صدی ہجری میں عقاید کے میدان میں اختلاف کا معرکہ گرم کیا۔ علمائے اسلام نے خالص عقلیت کو اسلام کی روحانی اقدار

کے لیے خطرناک خیال کرکے اسکے خلاف ذہنی جنگ کی اور آخر یونانی فلسفے اور منطق کو اپنی باندی بنالیا۔ لیکن یہ اسکے اولیں عہد کے فتنے تھے جسکی وجہ سے علمائے اسلام نے یونانی فلسفے و منطق کو ہمیشہ شبہ کی نگاہ سے دیکھا اور جب یہ علم کلام کے لیے پڑھایا جانے لگا تب بھی اسکی حیثیت ضمنی اور تابع علم کی ہی رہی۔ اپنی سابقہ عزت اور قوت یونانی فلسفے و منطق کو پھر اسلامی تہذیب میں کبھی نہ مل سکی۔ علمائے اسلام کے حلقے میں ابتک اسی تاریخی ذہنی جنگ کا عکس ہے کہ وہ کسی ایسے شعبہ علم کا مطالعہ اور فروغ پسند نہیں کرتے جو خالص دنیاوی ہو اور علمائے اسلام کے اختیار سے باہر ہو۔

اس تشدد اور تحدید کا ایک عجیب نتیجہ نکلا۔ علوم اسلامیہ کا دار و مدار عربی لسانیات (لغت، انشار، محاورات، معانی و بیان) پر ہو کے رہ گیا اور عربی شاعری کا دار و مدار عہد جاہلیت کی شاعری پر رہا۔ جس طرح عرصہ دراز تک مسیحیت کا دار و مدار لاطینی زبان پر تھا اور لاطینی زبان کی وجہ سے مسیحیت کو قدیم بت پرست روم کے خرافیات شاعری اور معاشرتی روایات کا پابند ہونا پڑا تھا۔ اسی طرح آج بھی علوم اسلامیہ کے طالب علم اور اُستاد کو خود بخود قدیم عرب کے تاریخی اور ادبی سرمائے کی تحصیل و تعظیم کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ عہد جاہلیت کے محاوروں سے اب بھی اخلاقیات کے اُصول بنائے جاتے ہیں۔ اور ان کی خوبیاں مبالغے سے بیان کی جاتی ہیں۔ اسلام پر عربیت کے ظاہری اثرات کی وجہ یہی ہے۔ پھر شروع کی چار صدیوں میں سارا مذہبی سرمایہ عربی میں جمع ہوا اور عربیت نے بعد میں بھی اپنا اثر اسلام پر ڈالا اور اسکے قالب پر اپنا رنگ چڑھا دیا ہے۔

○

اسلام کی صدیوں کی تاریخ میں ایک کشمکش سب سے نمایاں رہی ہے وہ یہ کہ تمام ذہنی اور علمی سرگرمیوں کو شریعت کے تابع رکھا جائے۔ اسلامی تہذیب میں ذہنی قوت کا سارا زور بار بار اسلامی علوم کی طرف آتا رہا اور عام و خاص کی توجہ اسی کی طرف لگی رہی، اُس نے فقہ، تفسیر، حدیث، کلام اور عربی لسانیات کو دنیا بھر کے ہر مسلم خطے میں ترقی اور افزائش کی سہولت دیدی۔ لیکن اسکے بعض مضر نتائج بھی تھے مثلاً ان علوم پر زوال آیا جو خالص مذہبی نہ تھے۔ ریاضیات، طب، فن تعمیر اور ہندسہ کا زوال اسی وجہ سے ہوا کہ توجہ ان کی محدود افادیت پر بھی نہ ٹکی اور خالص مذہبی علوم کو ترجیح دی گئی۔ پھر بھی اسلامی تہذیب نے بار بار بیرونی معلومات سے استفادہ کرکے تخلیقی سرگرمیوں کے دور تازہ کئے جیسے اندلس میں گیارھویں اور بارہویں صدی عیسوی میں ہوا اور ہندسہ، فلکیات، فلسفہ، جغرافیہ اور تاریخ عامہ کے ایسے شہ پارے وجود میں آئے جو اسلامی تہذیب کے آخری دورِ بہار کا سرمایہ ناز ہیں۔

○

لیکن اسلامی تمدن و تہذیب نے ایک مذہبی علم کو ایسی غیر معمولی ترقی دی کہ وہ عالمی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ عملی طور پر ذہن کی قوت کے استعمال کے لئے اسلامی تمدن میں علوم صحیحہ کی جگہ قانون کو ملی قانون کا ارتقار اسلامی تہذیب و تمدن کا عظیم ترین کارنامہ ہے اور اپنی ہمہ گیری، محنت اور ژرف نگاہی کے اعتبار سے قانون کے میدان میں مسلم ذہن کا ارتقا دنیا میں اپنی مثال آپ ہے، قانون سے مراد اسلام کی فقہ ہے جو دینی اور دنیاوی قانون پر حاوی ہے۔ احکامات خداوندی اور عمومی قانون سازی دونوں اس میں شامل ہیں۔ یہودیت کے علاوہ کسی مذہب میں یا کسی تہذیب و تمدن میں یا

قانون کی وسعت ایسی نہ تھی مسلمانوں نے تفصیل، ہمہ گیری، باریک بینی کے لحاظ سے فقہ اسلامی کو دنیا کا سب سے زیادہ مفصل مجموعہ قانون بنا دیا۔

قانون مسلمانوں کے لئے شوق، محنت اور علمی دل چسپی اور موشگافیوں کی چیز ہی نہ تھا نہ یہ صرف علماء و فقیہوں کا شغل تنہائی تھا، نہ قانون کا مقصد اسلام میں حکمراں طبقہ کے مفادات کا تحفظ تھا۔ فقہ اسلامی نے مسلمان عوام کی انفرادی اور سماجی زندگی میں تبدیلیاں لانے اور ان کو اسلام کے پسندیدہ سانچے میں ڈھالنے کا دور رس کام کیا۔ فقہ اسلامی اپنے تفصیلات کی بنا پر جماعتی وانفرادی زندگی کے گوشے گوشے تک گرفت رکھتا ہے تمام جماعتی وانفرادی سرگرمیوں کا رُخ مقرر کرتا ہے جس کی وجہ سے تمام مسلمان چاہے وہ لمحہ بھر پہلے ایمان لائے ہوں یا تیرہ صدیوں سے نسلاً بعد نسل مسلمان چلے آتے ہوں اپنی زندگی کو ایک معیار پر لانے کا یکساں سبق سیکھتے ہیں اور پرانے رواج، قدیم فراج اور طرز حیات کے مقابلے میں ملّت اسلامیہ کا رنگ و بو قبول کرتے ہیں یہ فقہ اسلام ہی ہے جس کی بنا پر اسلام مسلمانوں اور ملّت اسلامیہ میں وحدت، مرکزیت، اور اتحاد و توافق کا تصوّر قائم رہتا ہے۔ فقہ اسلامی عمل پسند ہے۔ یہ عقاید کے پختہ کرنے میں امداد دیتا ہے۔ یکجہتی پیدا کرتا ہے اور اسلام کے اس معیار اخلاق کو پورا کرتا ہے جس کا مطالبہ انسان سے ایک اور نیک ہونے کا ہے۔

فقہ اسلام کے مختلف طُرق و مذاہب ہیں مگر سب ایک ہی مرکز اور وحدت کی طرف لاتے ہیں: قرآن کی سمت جو احکام کا سرچشمہ ہے اور رسول کی سمت جو اپنے قول، عمل اور طور طریقے سے احکام قرآن کی عملی تشریح فرماتے تھے۔ فقہ کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے قریبی ساتھیوں کی زبانی روایات اور اُن

کے قیاس واجتہاد سے ہوا اور قیاس واجتہاد کا عمل آجتک فقہ اسلام کو ہر نئے مسئلے اور مرحلے میں اسلامی معیار سے حل ونجات پیش کرنے کی قوت دیتا ہے۔

○

فقہ کی قوت اور اہمیت بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب سیاسی انقلابات آنے شروع ہوگئے تو اسلامی تہذیب وتمدن کے سب سے بڑے نگراں ادارے یعنی سلطنت و حکومت کا طریقہ بدلا اور وہ بانیٔ اسلام کے تربیت کردہ خلفائے راشدین کی پاکیزہ خلافت اسلامیہ نہ رہی بلکہ ملوکیت وپادشاہی ہوگئی۔ اس کی وجہ سے اسلام میں انتشار پیدا ہوا اسکو روکنے کی صورت صرف قانون کے نفاذ سے ممکن تھی۔ یہ فقہ اسلام تھا جس نے حق اور ناحق کے درمیان امتیازی لکیر کھینچی۔ پھر جب عباسی خلافت نے گیارھویں صدی عیسوی میں تباہ حالی کی آخری حدوں کو چھولیا اور عالم اسلام میں انتشار کی حد ہوگئی۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں پر سردار قابض ہو کے بادشاہ بن بیٹھے۔ انتظامی اور سیاسی وحدت ختم ہوگئی خانہ جنگیوں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اور اسکی وجہ سے خلافت اسلامیہ کا فوجی اور اخلاقی اثر ختم ہوگیا اسوقت بھی یہ صرف فقہ اسلام ہی تھا جس نے عالم اسلام کو واحد اور متفق رکھا اور مسلم معاشرت کی حفاظت کی جس سے اسلامی تہذیب کی روایت قائم رہی۔

دسویں صدی عیسوی میں اسلام کی سلطنت کا جو رقبہ تھا وہ ۱۹۵۰ء کے اسلامی رقبے سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ مگر اس وقت ایک عظیم تہذیب کی بنیاد پڑ چکی تھی اور یہ پرورش پا رہی تھی۔ یہ ذہنی اعتبار سے تیز و طرار تھی، معاشی اعتبار سے وسعت پذیر اور خوشحال تھی، سکون واطمینان سے مالا مال تھی لیکن اسکی طاقت کا صرف ایک راز تھا وہ یہ کہ: فقہ اسلام نے اس تہذیب کو وہ سانچہ دیدیا تھا جو اسلام کی روحانی اور جذباتی قوت سے

معمور تھا۔ جب سیاسی انتشار پھیلتا گیا تو اسکی حالت بگڑتی گئی پھر بھی اسمیں روحانی اور جذباتی توانائی جتنی کچھ باقی رہی وہ فقہ اسلام کی بدولت تھی۔

○

اس زمانے میں اسلامی تہذیب کو حملہ آوروں اور نو مسلموں سے سابقہ پڑا سرحد پار سے آنے والے نیم وحشی اسلامی سلطنت پر قابض ہوگئے لیکن اسلامی تہذیب نے ان کو مسلمان بنایا اور صرف مسلمان بنانے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ اپنے قانون: فقہ اسلام کو انکی زندگی کا رہنما بنا کے ان وحشیوں کو تہذیب و تمدن کی عزت کرنا اور سلیقے سے جینے کا سبق دیا۔

عالمی نقطۂ نظر سے ان حملہ آوروں کے ذکر سے قبل اس سیلاب عظیم کا ذکر کرنا پڑیگا۔ جو ارض فلسطین پر تسلط کے لئے یورپ سے اُٹھا تھا اور جس نے تین صدیوں تک صلیبی جنگوں کا سلسلہ جاری رکھا اس حملے کے پس پشت انکے اندر مسلمانوں سے قدیم تعصب اور دشمنی کا جذبہ کار فرما تھا۔ جب اندلس سے اسلامی طاقت کا خاتمہ ہوا تو یورپ میں براہ راست عالم اسلام سے ٹکر لینے کی جرأت پیدا ہوئی اور پادریوں کے زیر علم ہزارہا مجاہدین صلیب نے اسلامی تہذیب کے تابناک علاقوں (شام و فلسطین) پر حملوں کا سلسلہ جاری کیا۔

ان حملہ آوروں کو کُردی نسل کے بے مثل فوجی قاید سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی (وفات ۱۱۹۳ء) نے اپنی حربی ذہانت اور سیاسی تدبر سے شکست دی اور ایسی شکست دی کہ صلیبی جنگوں کی طرح صلاح الدین کا نام بھی یورپ میں زبان زد خاص و عام ہوگیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی ذاتی نیک نفسی کا ان دشمنوں کو بھی اعتراف ہوا

اور اس میں شک نہیں کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے غیر معمولی نیک نفسی کا ثبوت دیا ورنہ جب مجاہدین صلیب شام و فلسطین کے شہروں کو جلاتے تھے، مسلمانوں کا قتل عام کرتے تھے کتب خانوں، شفا خانوں اور مسجدوں کو تباہ کرتے تھے تو سلطان صلاح الدین ایوبی جیسے علم دوست، خدا ترس، رحم دل کے لئے ان وحشیوں کے معاملہ میں صابر و عادل رہنا ناممکن سا تھا۔

جنگ صلیب نے یورپ کو عربوں کے علم اور تہذیب کا ذائقہ شناس بنا دیا، عالم اسلام سے تجارت ہونے لگی جس سے ہنر اور صنعتیں ترقی کرنے لگیں۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ طب، فلسفے، یونانی علوم اور طبیعات و کیمیا سے اہل یورپ آشنا ہوئے۔ عربی کتابوں کے ترجمے یورپ کی زبانوں میں ہوئے اور یورپ نے فکر و علم کی اس راہ پر قدم رکھا جو اسکو آج مشین کے دور میں لے آئی ہے۔

عالم اسلام کو جنگ ہائے صلیب سے بڑا نقصان یہ پہونچا کہ شام و فلسطین جیسے مرکز علم و فضل ان جنگوں میں تباہ ہو گئے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے بعد کوئی ایسا ہمہ گیر شخصیت رکھنے والا فوجی قاید اور حکمراں پیدا نہوا جو عالم اسلام کو ایک کر دیتا۔ خود سلطان صلاح الدین ایوبی کو حرب و ضرب نے اسکی فرصت نہ دی کہ وہ وحدت کے کسی ایسے کام کا بیڑا اٹھاتے انھوں نے خود کو بغداد کے برائے نام عباسی خلیفہ کے تابع سمجھا۔

سلطان صلاح الدین اس دور انحطاط کی سب سے جلیل و جمیل شخصیت ہیں بکہ و تنہا کمتر درجہ کی فوجی طاقت کے باوصف انھوں نے یورپ کے متحدہ لشکروں کا مقابلہ کیا اور انکو شکست فاش دی۔ مصر میں انھوں نے ایک سادہ، باصلاحیت اور مستعد نظام حکومت قائم کیا۔ بڑی سختی سے نظام حکومت اور معاشرے کو شریعت اسلام کے تابع کیا اور اپنے مشیروں کے طور پر حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی چاروں مکاتیب فکر کے قاضیوں کا تقرر کر کے

انتظامی وحدت لانے کی سعی کی۔ اگر وہ خود عالم اسلام کی خلافت کے خواب دیکھتے تو شاید کامیاب بھی رہتے بلکہ اسلام کے عہد انحطاط کو پھر عہد قوت میں بدل دیتے مگر ان کا ذاتی انکسار، خلوص اور خدمت اسلام کا ذوق کسی ایسے بڑے قدم کے لئے تیار نہ ہوا جو انکی ذات کو بلند و برتر بنا دیتا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کے بعد اسلامی تہذیب کو ان حملہ آوروں سے سابقہ پڑا جو بالکل وحشی تھے گو یہ بھی آخر میں مسلمان ہوئے اور اسلامی تہذیب کے محافظ و خادم بن گئے لیکن انھوں نے ابتدا میں اسلامی شہروں بستیوں اور علمی مراکز کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا کے اسلامی تہذیب کو بہت مضمحل بنا دیا۔ انکی وجہ سے زندگی کا شیرازہ بہت دنوں تک بکھرا رہا۔ مرکزیت ختم ہوگئی اور عالم اسلام کو ایسے انتشار سے دوچار ہونا پڑا جس نے عرصہ دراز تک ترقی کے راستے بند رکھے۔

یہ حملہ آور وسط ایشیا کے باشندے تھے۔ یہ لوگ نویں صدی عیسوی میں ایران، عراق اور اناطولیہ میں اُترنے لگے تھے۔ اس سے بہت قبل انکی کثیر تعداد وسط ایشیا میں عرب تاجروں سیاحوں اور بزرگان دین کے ہاتھوں اسلام قبول کر چکی تھی۔ اس لئے جب پہلے پہلے نومسلم ترکوں، کردوں اور ایرانیوں کا اقتدار ایران و عراق اور کابل، ہرات، سمرقند میں قائم ہوا تو اسلامی تہذیب و تمدن پر ان کا کوئی بُرا اثر نہ پڑا۔ فوجی مہمات، فتوحات اور توسیع سلطنت کا ایک نیا سلسلہ چل پڑا جس نے شمالی ہند سے لیکر ایشیائے کوچک تک سلطنت اسلام کی سرحدوں کو بڑھا دیا۔

ان نومسلم اور نیم وحشی عناصر میں ایک اور عنصر مغربی افریقہ کے بربر قبائل کا تھا انھوں نے تبلیغ و جہاد کے علم اٹھا رکھے تھے ان کی وجہ سے اسلام وسط افریقہ اور مشرقی افریقہ

میں پھیل گیا۔ ان بربروں نے خود مراکش میں ایک ایسی مسلم سلطنت قائم کی جہاں اسلامی تہذیب اور علوم نے افریقہ کی گرم و خشک و سیاہ زمین پر ایک فردوس آباد کردی۔ یہ یورپ سے تجارت کرتے تھے اور اندلس کے مسلمانوں کے بازو میں بازو ڈالے مسیحی علاقوں کی بحری اور بری ترک تازیاں کرتے تھے۔ انہی لوگوں نے طنجہ کو عالمی تجارت کا مرکز بنایا اور بحیرۂ روم میں اپنے جہاز رواں دواں کئے اور یہی لوگ چار صدیوں تک مغرب کے سیلاب کو ایشیا اور افریقہ کی سمت بڑھنے سے روکتے رہے۔

○

ان نیم وحشی اور نومسلم عناصر کے عروج و اقتدار نے اسلامی تہذیب کو ایک سخت مرحلے میں لا کھڑا کیا سوال یہ تھا کہ اسلامی تہذیب جس نے اپنے عروج وارتقا کا آغاز شہریت و تمدنیت سے کیا اور جو وحشت و خانہ بدوشی سے نکل کے بستیاں بسانے اور ذہنی علوم کی فضا میں سانس لینے سے زندہ تھی، اب کیا شکل اختیار کرے؟ اسکی قوت گھٹ گئی تھی، عرب کے خانہ بدوش بدوی قبائل پھر اس سے علیحدہ تھے یعنی یہ اسلام کے عہد اوّلیں سے دور ہو چکی تھی۔ قبایلی نظام نے پھر جگہ جگہ قوت پکڑ لی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید اب اسلامی تہذیب کے مرض کی تشخیص و علاج کوئی نہ کر سکے گا اور یہ زندہ نہیں رہے گی۔

قدیم شہروں اور شہری تمدن میں خرابیاں بھی تھیں یہ اسلامی نہیں رہ گیا تھا۔ اس پر دنیا پرستی عیش و عشرت اور ظاہر پرستی چھا گئی تھی۔ علمائے اسلام اور ان سلاطین وقت نے جو اکثر و بیشتر اچھے عقیدے کے مسلمان تھے اس خرابی کو جانا اور اسکے تدارک کی کوشش کی۔ اسلامی تہذیب کو غیر صالح عناصر سے پاک بنانے کے لئے قانون اور قانون

کے نفاذ سے کام لینے کی جدوجہد ہوئی اور اکثر اس جدوجہد نے بڑی سختی، تشدد اور تعصب کا رویہ بھی اختیار کیا۔ جماعتی اور انفرادی زندگی میں جو خرابیاں تھیں ان کا سلسلہ عقاید کی باریک بحثوں سے ملا دیا گیا اسکی بنا پر باہمی تنازع اور بڑھے۔ غرض آثار ایسے تھے کہ علمائے اسلام اور سلاطین وقت دونوں ان خرابیوں کے آگے بے بس تھے۔ مرکزی خلافت کی کمزوری نے فقہ اسلام کو کمزور کر دیا تھا اور عام نافرمانی کی وجہ سے فقہ کے احکام و اصول کتابی بن کے رہ گئے تھے۔

یہ اسلامی تہذیب کے بڑے نازک زمانے کی بات ہے جبکہ ایک نئی قوت نمودار ہو کے اسلامی تہذیب کی خادم اور اسکی محافظ بن گئی۔ یہ تصوف اور صوفیائے کرام کے سلاسل تھے جنھوں نے اس پُر آشوب زمانے میں ایقان و تسلّی کی مشعل روشن کی۔ اسلامی معاشرے میں عرصہ دراز سے اُنکی خاموش قوت موجود تھی۔ یہ عام اخلاقی اقدار، دینی تصورات اور شعروادب پر برابر اپنا اثر ڈالتے چلے آتے تھے۔ ساتویں صدی ہجری میں بغداد کی مغل یورش کے ہاتھوں تباہی سے بہت قبل: دوسری صدی ہجری میں تصوف کے اثر نے شعر وادب میں نفوذ شروع کر دیا تھا۔ اور تباہی بغداد ۱۲۵۸ء سے قبل رابعہ شامیہ (وفات ۸۰۱ء) سری سقطی (وفات ۸۶۷ء) سمنون بن حمزہ (وفات ۹۱۰ء) سید عبدالقادر جیلانی (وفات ۱۱۶۶ء) اور ابن عربی کے علاوہ حکیم سنائی (وفات ۱۱۳۱ء) خاقانی (وفات ۱۱۹۹ء) اور فریدالدین عطار (وفات ۱۲۳۰ء) نے نظم و نثر میں انسان دوستی گداز اور عشق الٰہی کے پُراثر اور دوررس کارنامے شائع کر دئے تھے۔

○

تصوف کی قوت اسلامی تہذیب کے دیندار، پڑھے لکھے اور سوچنے سمجھنے والے طبقہ سے

آئی تھی، شہری تمدن رکھنے والے مسلمانوں نے جو تجارت، صناعت اور حرفت پر قابض تھے، تہذیب و تمدن کو مریض و بیمار دیکھ کے اسکی شفا بخشی کی فکر کی۔ چند صدی قبل یہی شہری افراد ملت طرح طرح کی ذہنی اُلجھنوں کا شکار تھے۔ نیم فلسفیانہ اور نیم اسلامی عقاید رکھنے والے فرقے ان کو اپنے دام میں بارہا اسیر کر چکے تھے۔ دیار اسلام کے تمام بڑے، آباد خوشحال شہروں میں یہی لوگ گیارھویں صدی عیسوی سے تصوف کے پُر جوش حامی اور علم بردار بن گئے اب ان کو یونانی فلسفے اور منطق کے مغالطوں اور خامکار علوم سے نجات مل چکی تھی اور فقہ اسلام کی وسعت نے ذہنوں کو اسلام کی طرف سے مطمئن کر دیا تھا۔ پھر بھی تصوّف کو پہلے پہل علمائے اسلام کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا بلکہ ایک تصادم بھی شریعت، اور طریقت کے درمیان شروع ہو گیا مگر اولین تصوف کے مخلص حامیوں نے نرمی سے کام لیا، انکی یہی نرمی، سادگی، عوام دوستی انکے عروج کا ذریعہ بنی، علمائے اسلام کے ایک طبقہ کے مقابلے میں جو تصوف اور صوفیوں کا شدید مخالف تھا عام مسلمانوں نے تصوف دوستوں کی صلح جوئی اور رواداری کو پسندیدہ سمجھا اور صوفیوں کا اثر بڑھتا گیا۔

تصوف کا زور انفرادیت کی طرف زیادہ تھا۔ یہ شخصی اور ذاتی زندگی کے مسائل، ذہنی الجھنوں اور لاشعوری ہیجان و اضطراب کے دفعیہ کے لئے وجود میں آیا تھا۔ اس کا مقصد لوگوں کو تحلیل نفسی سے روشناس کرانا تھا۔ اسلئے تصوف کے عرب رہنماؤں حسن بصری، ذوالنون مصری، بایزید بسطامی، رابعہ بصری، جنید بغدادی، خواجہ شبلی، عثمان ہارونی جیسے صوفیوں نے سیدھے سادے طریقے پر ذہنوں کا رُخ انفرادی زندگی پر اور اسکے تاریک گوشوں کی سمت موڑا اور لوگوں کو اس بات پر توجہ دلائی کہ وہ نظریے اور عمل میں ہم آہنگی اور فکر و نظر میں یکسوئی پیدا کریں۔ ان اوّلین صوفیوں میں (جو عرب تھے)

خیال وفکر کی وہ تردیدگی نہیں ہے جو بعد کے صوفیوں میں فلسفے اور علم کلام سے آئی، اور
سرار و رموز نیکے تصوف کا جز غالب بن گئی اور ایک نئے ذہنی انتشار کا سبب خاص
ثابت ہوئی۔

اہلِ تصوف نے تبلیغ اسلام کا نمایاں فریضہ انجام دیا یہ صرف غیر مسلم گروہوں کو اسلام
کی ملت حنیف میں لانے کے باعث نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے ان علاقوں کو بھی اپنی
سرگرمیوں کا مرکز بنایا جہاں کی آبادی اسلام سے حقیقی طور پر آشنا نہ تھی۔ اسلام کی
روشنی افریقہ کے وسط میں، ہندوستان، انڈونیشیا، وسط ایشیا، ترکستان، چین اور
بلقانی یورپ میں پہونچ گئی۔ صوفی چاہے تن تنہا کام کرتے تھے چاہے خانقاہیں بنا کے
کسی علاقے میں بستے تھے، انکی تبلیغ میں جوش، گرمی اور دل موہ لینے کا سلیقہ ہوتا تھا
یہ مقامی لوگوں سے انکی زبان میں بولتے تھے اور ان کے طور طریقوں کو اپناتے تھے
اور اپنائیت کے احساس کو جگا کے انکو اپنا بناتے تھے۔ صوفیوں نے بے شمار مقامی
بولیوں اور زبانوں میں تبلیغی، اخلاقی اور روحانی ادبیات کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ علوم اسلام
کو مقامی زبانوں میں ترجمہ اور تالیف کے ذریعے منتقل کرنے کا کام بھی صوفیوں نے ہی انجام
دیا انھوں نے دل گرما دینے والی شاعری کی اور تصوف کو ایک آزاد، متحرک، خودکفیل
قوت بنا دیا اور تصوف کو اسلام کی تاریخ میں امتیاز کی وہ جگہ مل گئی جس کے اصل مستحق
صوفی تھے، تصوف نہ تھا۔

اور تصوف بھی زوال کا شکار ہوا اور اس میں فلسفے اور یونانی الٰہیات کے عمل دخل
نے اسکو مجموعہ اضداد اور الجھن پیدا کرنے والا معمہ بنا دیا۔ نو افلاطونی فلسفے اور یہودیت
وعیسائیت کی راہبانہ روایات کی آلودگی نے اسکی عمل پسندی، سادگی، جوش اصلاح و

تعمیر کو ختم کر کے رکھ دیا۔ زندگی کے معاملات، معاشرے، انفرادی سیرت و کردار سے جو تصوف کا دائرہ کار تھے، صوفیوں کا تعلق کٹ گیا اور زندگی سے فرار، واہمہ پرستی اور مرکزیت سے گریز کی شدید خرابیاں ان میں پیدا ہوئیں۔ وقتاً فوقتاً طرح طرح کے گمراہ صوفی فرقے عجیب وغریب لباسوں، پراسرار نعروں، سحر و کہانت کی شعبدہ گریوں، غیب بینی اور کرامات کے دعووں کو لے کے اُٹھے، انھوں نے عوام کو گمراہ کرنے میں عارضی کامیابیاں بھی حاصل کیں مگر اسلامی تہذیب کی مجموعی توانائی نے جو کتاب اللہ، سنت رسول اور شریعت اسلام سے معمور تھی، ان کو پنپنے کا موقعہ نہ دیا، خود تصوف کے میدان میں برابر ایسے مصلح و ذہنی قاید پیدا ہوتے رہے جو ایک طرف عملی نفسیات اور نظری تصوف کے ماہر تھے تو دوسری طرف علوم اسلامیہ میں گہری بصیرت رکھتے تھے، انھوں نے تصوف کی گمراہیوں کی اصلاح کی اور اس قدیم، عربی تصوف کا احیا کرتے رہے جس کا مقصد انفرادی اصلاح سے ملت اسلام کی خدمت تھا۔

تصوف کی انحطاطی کیفیات کا اثر خاص طور پر خود تصوف پر پڑا۔ سب سے زیادہ ان گمراہ فرقوں نے تصوف ہی کو نقصان پہنچایا کہ پڑھے لکھے مسلمانوں میں تصوف کو فکری لغزشوں رہبانیت اور مرکز گریز فرار پسندی کا ملغوبہ خیال کیا جانے لگا ہے۔

○

عرب صوفیوں نے جس اخلاقی اور ذہنی زوال کے سیلاب کو روکنا چاہا تھا اس کی سب سے بڑی وجہ اسلام کی سیاسی اور انتظامی مرکزیت کی کمزوری تھی۔ بغداد میں عباسی حکمرانوں کے اقتدار کو گھن لگنے سے یہ کمزوری پیدا ہوئی تھی ایک طرف تو بغداد اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شہر تھا، علم و حکمت، تجارت و صنعت کا مرکز تھا دوسری طرف دن بہ دن

بغداد عالم اسلام پر سے اپنا اقتدار کھوتا گیا پہلے امیر عبدالرحمٰن الداخل (وفات ۷۸۸ء)
نے اندلس میں مرکزی خلافت کے مقابلے میں بنو اُمیّہ کی ایک نئی خلافت کی بنیاد رکھی،
اسکے بعد مراکش سے لیکر مصر تک کے علاقے رفتہ رفتہ بغداد کی ماتحتی سے علیحدہ ہوتے گئے،
یہاں تک کہ ۹۶۹ء میں بنو فاطمہ نے بھی مصر میں متوازی خلافت قائم کرلی خود بغداد میں
اقتدار کی باگ ڈور عباسی حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکل کے غیر عرب فوجی قایدوں اور وزیروں
کے ہاتھ آچکی تھیں۔ عباسی حکمراں کٹھ پتلی بن چکے تھے ان وجوہ سے ایران، ماوراء النہر،
افغانستان، ہندوستان اور ایشیائے کوچک میں ایسی سلطنتیں قائم ہوگئیں جو بغداد کے
عباسی خلیفہ کے سیاسی اور انتظامی اثر سے بالکل آزاد تھیں، البتہ کبھی کبھار تبرک کے
طور پر بغداد کو تحفہ تحائف روانہ کرکے عباسی حکمراں سے پروانہ حکومت حاصل کرلیتی تھیں
ان تمام ملوک الطوائف کے ماتحت علاقے میں گو عام قانون، اسلامی شریعت کا رائج
تھا لیکن یہ ملوک الطوائف خود معاملات سلطنت میں فقہ اور شریعت کے دخل کو اپنے
مفادات ذاتی کے لئے مضر خیال کرتے تھے اور مزید برآں یہ خود مسلمانوں کے مذہبی اور
روحانی حکمراں ہونے کا رتبہ نہ رکھنے کے باعث زیادہ تر اپنی قوت کا دار و مدار تسلّط و
تشدّد پر رکھتے تھے۔

ان ملوک الطوائف کے علاقوں میں اسلامی تہذیب کو سرپرستی حاصل نہ تھی اُنھوں
نے قدیم مشرقی تاجداروں کے طرز حیات اور نظام سلطنت کو اپنایا جو اسلامی تہذیب سے
بہت مختلف تھے۔ علمائے اسلام نے مسلسل جد و جہد کی کہ وہ ملوک الطوائف کو فقہ اسلام
اور شریعت کے تابع رکھیں کبھی کبھی انفرادی طور پر ان بادشاہوں میں ایسے لوگ بھی پیدا
ہوئے جنھوں نے علمائے اسلام یا صوفیان کرام سے عقیدت و تعلق کی بنا پر نظام سلطنت کو

شریعت کے تابع کیا مگر خاندانی بادشاہت اور خود سری نے کوئی مستقل اصلاح نہ ہونے دی البتہ علمائے اسلام نے بڑی جرأت اور پامردی سے خلافت اسلامیہ اور مسلم بادشاہت کے درمیان خط فاصل کھینچ کے اسکو قائم رکھا اور ضرورت پڑی تو اس امتیاز کو نمایاں کرنے میں قید و بند، کوڑوں کی مار، جلاد کی تلوار اور رشوت سب کا مقابلہ کیا۔

پھر بھی مراکش سے ملایا تک سارا عالم اسلامی ایک ایسے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا جسے اسلامی تہذیب نے صدیوں کی آگ میں رفتہ رفتہ پکا کے پختہ کیا تھا، عام مسلمان اور صناعوں، تاجروں اور زمین داروں کا متوسط طبقہ پورے خلوص اور سچے جذبے سے مسلمان تھا، شریعت کے پابند اور اخوت و مساوات کے تصورات سے مالامال تھا یہ علمائے اسلام کے زیر اثر تھے اور ملوک الطوائف کی اطاعت کو ایک وقتی سیاسی ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔

اس دور میں سب سے بڑا حادثہ وحشی مغلوں کے ہاتھ بغداد کی تباہی ہے جو ۱۲۵۸ء میں ہوئی۔ یورش تاتار کے فسانۂ خونی کا سلسلہ ۱۲۲۰ء سے شروع ہوتا ہے، جب یہ لوگ شمالی مشرقی علاقوں پر حملہ آور ہوئے اور ۱۲۲۵ء میں ان پر قابض ہو گئے، یہ کافر گروہ بالکل جنگلی اور وحشی تھے۔ انھوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کے ایک وسیع علاقہ میں مسجدوں، کتب خانوں، مدرسوں، خانقاہوں اور ان بستیوں کو تہس نہس کر دیا جو علم و فن کے مرکز تھیں جب ۱۲۵۸ء میں بغداد پر قبضہ ہوا تو شہر میں قتل عام کے بعد یہ تباہی آخری عباسی حکمراں مستعصم باللہ کی مظلومانہ شہادت پر ختم ہوئی۔ بغداد جلا کے راکھ بنا دیا گیا اور دجلہ میں اتنی کتابیں پھینکی گئیں کہ سیاہی کی وجہ سے دریا کا پانی تین دن تک کالا رہا۔ بغداد کی تباہی نے اسلامی تہذیب کے آثار کو سب سے بڑا صدمہ پہونچایا۔ صدہا

علوم اور ہنر مندیاں ایسی مٹیں کہ پھر نہ پنپ سکیں۔ معلم اخلاق سعدی شیراز نے بغداد کا مرثیہ لکھا۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
برزوال ملک مستعصم امیر المومنین

لیکن اسلامی تہذیب کے ایک مرکز مصر میں ابھی فوجی اور سیاسی طاقت موجود تھی۔ وہاں کے مملوک سلطان ملک منظفر الدین بیبرس (وفات ۱۲۷۷ء) نے شام کے میدانوں میں تاتاریوں سے لوہا لیا۔ اور معرکہ عین جالوت (سنہ ۱۲۶۰ء) میں تاتاری لشکر کو ایسی ہولناک شکست دی کہ وہ بھاگ کے ایران کے انتہائی شمالی علاقے میں جا رہے۔ مصر کے مملوک سلاطین کے تحت ڈھائی صدی تک ایک خوشرنگ تمدن پھلتا پھولتا رہا جس پر عربیت غالب تھی یہاں فن تعمیر اور برنجی ظروف سازی نے بڑی ترقی کی قاہرہ کی جامعہ ازہر (قیام سنہ ۹۸۰ء) علوم اسلامیہ کا سب سے بڑا مرکز بن گئی۔ اندلس سے بھی مسلمانوں کا خاتمہ سنہ ۱۴۹۲ء میں ہو چکا تھا اور اس عظیم عرب اسلامی تمدن کے خاتمے کے بعد عرب اسلامی تہذیب کا سنبھلنا ناممکن ہی تھا۔

○

مگر خدا کے فضل سے اسکے بعد بھی کعبہ کو صنم خانوں سے پاسبان ملے یعنی حملہ آور تاتاری اور مغل مسلمان ہو گئے اور انھوں نے اسلامی تہذیب کی پرورش میں حصہ لینا شروع کیا ایرانی اسلامی تہذیب کا بڑی قوت سے آغاز ہوا جو مغلوں کے تحت ایران و افغانستان و ہندوستان میں پھلی پھولی۔ فارسی زبان میں فقہ، تفسیر، حدیث اور تاریخ کے ترجمے ہوئے عربی زبان کی تحصیل ایک اصل مذہبی زبان کی طرح کی جاتی رہی۔ لیکن تمام علوم و فنون کے

لئے فارسی زبان ہی ذریعہ اظہار بن گئی۔ فقہ اور طب کی کثیر کتابیں فارسی میں مرتب ہوئیں۔ فارسی میں اسلامی ادبیات کا عہد زرّیں شروع ہوا، مولانا رومی، فریدالدین عطار، حکیم سنائی، سعدی، شمس تبریزی، امیر خسرو، جامی نے شعروادب اور اخلاقیات کے ذخیرے میں بیش بہا اضافے کئے اور ہندوستان کی مسلم سلطنتوں، افغانستان اور ایران کی حکومتوں کے انتظامیہ اور عدلیہ کی زبان فارسی بہت جلد اسلامی تہذیب کے شہ پاروں سے معمور ہوگئی۔ فارسی شعروادب پر تصوف کا گہرا رنگ تھا جس نے تصوف کو عام و مقبول بنانے میں بڑا حصہ لیا اس دور میں صوفیائے کرام کی ایک کثیر تعداد نے عرب صوفیا کے برعکس تحریر کو ذریعہ تبلیغ و اصلاح بنایا اور فارسی میں تصوف کے زیر اثر صدہا کتابیں مرتب کی گئیں۔ ایرانی اسلامی تہذیب کے طرز حکومت میں خاص بات یہ تھی کہ گو اعلیٰ فوجی اور سیاسی قیادت ہمیشہ غیر مذہبی افراد کے ہاتھ میں رہی لیکن نظم حکومت کا دارومدار فقہ و شریعت پر رہا اور بادشاہوں کے لئے اسلامی قانون کے مجموعے مرتب کئے گئے۔ ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیر (وفات ۱۷۰۷ء) کے لئے "فتاویٰ عالمگیری"۔ ایران کے شیعہ حکمراں شاہ عباس صفوی (وفات ۱۶۲۹ء) کے لئے "جامع عباسی" کی ترتیب اسکی بہترین مثال ہیں۔

○

ایشیائے کوچک میں عثمانلی تورکوں نے ترک اسلامی تہذیب کی اساس رکھی جو سلطان سلیمان اعظم قانونی (وفات ۱۵۶۶ء) کے عہد میں شباب کو پہونچی جس نے عثمانلی تورکوں کے پرچم کو نیل سے ڈینیوب تک لہرایا: بحیرہ روم میں فرنگی بحری مرکزوں کا خاتمہ کیا۔ اسکے امیر البحر خیرالدین پاشا (وفات ۱۵۴۶ء) نے بحری جنگوں میں فرنگی ملکوں کے متحدہ بیڑوں کو شکست فاش سے بارہا دوچار کیا۔ عثمانلی تورکوں نے سلطان صلاح الدین ایوبی کے

بوجھ کو اپنے کندھوں پر اُٹھایا اور تین صدی تک یورپ کو ایشیا کی شمشیر آتش زن بن کے بارہا سخت مجروح کیا۔ سلطان سلیم اوّل وفات ۱۵۲۰ء کے وقت میں حرمین شریفین پر عثمانی تورکوں کا قبضہ ہوگیا اور ترک سلطنت کے حکمراں نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا یہ خلافت ۱۹۲۲ء تک قائم رہی اور نوجوان ترکوں کے ہاتھوں ختم ہوئی ان دنوں ترکی ایک قومی جمہوریت ہے۔

چھ سو سال کا عرصہ عثمانی تورکوں نے ترک اسلامی تہذیب کی پرورش میں گزارا لیکن وہ سب سے پہلے سپاہی تھے اور سب سے آخر بھی سپاہی رہے۔ فرنگ کے دباؤ نے انکو کسی صدی میں دس سال بھی چین سے بیٹھ کے صلح و امن کے علوم و فنون کی طرف توجہ کا موقعہ نہ دیا پھر بھی ترکی فن تعمیر نے خوبصورت عمارتوں کے لازوال نمونے دنیا کے سامنے رکھے جن میں جامع سلیمانی (تعمیر ۱۵۵۲ء) قابل ذکر ہے۔

ترکوں نے فقہ، تاریخ اور فنون حرب میں اچھی کتابیں لکھیں انکے شعر و ادب پر حرب و ضرب کا جوش اور گہری یاسیت ایک ساتھ چھائی ہوئی ہے۔

○

اٹھارہویں صدی عیسوی صنعتی دور اور مشین کے گھومتے پہیئے کی آمد آمد کی صدی تھی صنعتی انقلاب نے یکلخت توازن قوت بدل دیا تھا۔ اسلامی تہذیب کو اس صدی میں سیاسی زوال سے جو صدمہ پہونچا اسکی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں مغلوں کا اور ترکی میں عثمانی حکمرانوں کا فوجی دبدبہ گھٹ گیا تھا۔ مرہٹوں کی بغاوت نے مغل سلطنت کمزور کی اور آخر ۱۸۵۷ء میں ملک انگریزی سامراج کے قبضہ میں چلا گیا۔ عثمانی تورک تین صدیوں تک لڑتے لڑتے تھک گئے تھے آخر یورپ کی متحدہ سازش نے انکی سلطنت کو

بلقان سے بالکل ختم کردیا اور سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں شکست خوردہ فریق کی حیثیت سے ان کے عرب مقبوضات ان سے چھین لئے گئے اور عظیم و جلیل عثمانی حکمرانوں کی وراثت ایک مختصر سے حقیر جمہوریہ ترکی کو بمشکل مل سکی۔ ایران میں خاندان صفوی کے حکمراں پھر کوئی شاہ اسمٰعیل اور عباس اعظم نہ پیدا کر سکے اور یہ قدیم تہذیب سے آراستہ ملک ہمہ جہت پستی میں گر پڑا تو پھر اب تک نہ سنبھل سکا۔ اس طرح ایرانی اسلامی تہذیب کا بھی چشمہ فیض بند ہوگیا جس نے ہندوستان ایران افغانستان میں فن تعمیر، معاشرت، شعروادب، فنون لطیفہ عدلیہ اور انتظامیہ کی نئی روایات قائم کی تھیں۔

اٹھارویں صدی میں مراکش، الجزائر، ٹیونس، مصر، سوڈان، سمالی لینڈ، زنجبار مسقط و عمان، ہندوستان ملایا اور انڈونیشیا جیسے زرخیز و زرپاش ملک اقلیم اسلام سے نکل کے صلیب کے سامراجی سایے میں چلے گئے تھے۔ یہاں مسلمانوں کو مغربی سامراج اور مغربی تہذیب کے دوہرے حملوں کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔ پھر عراق، شام، فلسطین کو بھی اسی سامراج کا سامنا ایک صدی بعد کرنا پڑا۔ اس فضا میں دو تحریکیں پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ ایک تو سامراج کے خلاف قومی آزادی کی تحریک دوسرے تجدید و احیائے اسلام کی تحریک دوسری نوعیت کی بہت سی تحریکوں نے اسلام کے ظاہر و باطن کی پاسداری کی اور اسکو مخالفانہ حملوں سے بچایا گزشتہ دو صدیوں میں مراکش سے ملایا تک ہر مسلم علاقے میں ایسے ہی برگزیدہ اور مقدس افراد برابر نمودار ہوتے رہے جو سامراج سے جنگ کے لئے ایک ہاتھ میں تلوار رکھتے تھے اور دوسرے سے قرآن کو سینے سے لگائے رکھتے تھے۔

○

یہ اسلام کی تیرہ صدیوں کی تاریخ کا خلاصہ ہے یہ اسلام کے کارواں کے صحرائے عرب سے چلنے اور مراکش و ملایا تک پیام حق لے جانے کی داستان ہے تیرہ سو سال میں اسلام کرہ زمین کے وسط پر ایک ایسے بہترین علاقے میں جم کے ثمر خیز ہو چکا ہے جو شمالی افریقہ کے کنارے سے شروع ہوتا ہے اور نصف افریقہ، مشرق وسطیٰ، ترکی، وسط ایشیا، ایران، ہندو پاکستان سے ہوتا ہوا ملایا اور انڈونیشیا تک جاتا ہے اور دنیا کی چھت تبت کے اس پار سنکیانگ اور چین میں اپنے کروروں پیرو رکھتا ہے ملایا، انڈونیشیا اور چین میں اسلام تاجروں کی تبلیغ سے پھیلا تھا۔ اور یہاں کی اسلامی حکومتیں بھی ہمیشہ مقامی مسلمانوں کی رہی ہیں اسلئے ملایا، انڈونیشیا اور چین کے مسلمان قدیم مقامی تمدن میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وہ اسلامی ناموں کے علاوہ مقامی نام بھی رکھتے ہیں۔ قدیم معاشرت کے پابند ہیں۔ بول چال، کھانا پینا، رسم و رسوم سب غیر مسلم ہم قوموں جیسی ہے لیکن اسلام کی عالمگیر حیثیت کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ کبھی ان مسلمانوں کو مقامی رنگ میں رنگے رہنے کی بنا پر ملت اسلام سے خارج نہیں سمجھا گیا۔ لیکن پھر بھی اسلام نے تینوں جگہ اپنے حلقے اور فضا میں بڑی تبدیلیاں کی ہیں۔ چین، ملایا، انڈونیشیا تینوں جگہ مسلمانوں کے لباس میں احکام ستر و حجاب کی وجہ سے دوسروں سے فرق ہے۔ وہ اپنے ملک کی مشرکانہ رسومات سے الگ ہیں۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے میں اسلامی آداب برتنے کے اور جینے مرنے میں اسلامی اصولوں پر عمل کر کے وہ اپنے غیر مذہب ہم قوموں سے امتیاز قائم کرتے ہیں۔ عربی ہر جگہ قرآن کے اصل رسم الخط میں پڑھتے ہیں اور ملائی اور انڈونیشی زبانوں کا تو رسم خط بھی تسخ ہو گیا ہے۔ ان ممالک کے فن تعمیر پر عربی اثرات ہیں اور علوم دینی کی تدریس کیلئے یہاں

کے مقامی عالم عربی زبان و ادب پر قدرت حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

عالم اسلام میں ایک نمایاں وحدت ہے۔ جہاں جہاں مسلمان ہیں وہاں فن تعمیر اُٹھنے بیٹھنے، رہنے بسنے، لباس اور طرز تعلیم میں مقامی رنگ سے وہ مختلف ہیں۔ مسجد اسلام کا امتیازی نشان ہے جو کھلی، روشن ہوا دار ہوتی ہے۔ نقوش والے ستون اور دیواروں پر پچی کاری، محرابوں کی نازک تراش اور انکی کمانوں پر اقلیدسی وضع کی گل کاریاں خوبصورت بیضوی گنبد اور سڈول مینار جو مسجد کے عالمی فن تعمیر میں شامل ہوئے ہیں، گو بہت بعد کے اضافے اور تمدنی ترقیوں کے نتائج ہیں مگر انھوں نے مسجد کی اس اصل سادگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک و مقدس زمانے میں کچی دیواروں اور کھجور کے تنوں کے پٹاؤ کی چھت سے ظاہر ہوتی تھی۔ مسجد کو اس مقدس زمانے سے لیکر اب تک مسلم معاشرے کے دینی، سماجی اور ذہنی مرکز کی حیثیت حاصل ہے یہ باجماعت نماز کا مقام ہے جو افراد کو جماعت اسلامی سے جوڑتی ہے۔ یہ تنہا عبادت کی جگہ ہے جہاں بندہ اپنے خدائے واحد کی درگاہ میں بصد خلوص حاضر ہوتا ہے اور یہ بنیادی مذہبی تعلیم کا مرکز ہے جو عقاید اسلام، قرآن کے رسم الخط سے واقفیت، تلفظ و مخارج پر قدرت اور حفظ و قرأت کے اصولوں کے مطابق دنیا کی تمام مسجدوں میں مسلمان بچوں کو دی جاتی ہے۔

مسلمانوں کے فن تعمیر میں مسجد کا طرز نمایاں درجہ رکھتا ہے اسکے بنیادی اجزا: محراب منبر، ستون، مینار اور گنبد دنیا کے ہر حصہ میں مسلمانوں کے لئے جانی بوجھی چیزوں کا درجہ رکھتے ہیں اور انکی عمارتوں میں یہ اجزا لازماً شامل ہوئے ہیں۔ مسجد کی روشن، ہوادار اور کھلی فضا کو بھی مسلم فن تعمیر کے ماہروں نے عمارت کا بنیادی خاصہ مان لیا

ہے اور ہر جگہ ان کی تعمیر کردہ عمارتوں میں وسیع اور روشن حصے، ہوا کے لئے نازک مہندسی اہتمام اور عمارتوں کے حصوں میں باہمی تعلق کے لئے محرابوں والے دالانوں، فوارہ دار صحن اور بلند سقف دار حجروں کا استعمال ملتا ہے، تصویر کشی کی ممانعت کی وجہ سے خطاطی کے فن میں طغرا نگاری سے در و بام کی تزئین، پچی کاری، گل بوٹے بنانا، اقلیدسی زینت کاری اور قیمتی پتھروں کی الواح سے آرائش کرنے کے طریقے بھی مسجد کی تعمیر کے ذوق نے پیدا کئے اور یہ رفتہ رفتہ مسلم فن تعمیر کے اجزا لازمہ شمار ہونے لگے۔

○

کرۂ زمین کے اس وسطی علاقے میں تقریباً ہر نسل کی آبادی ہے۔ ترک، عرب، تاتاری، ایرانی، پختون، حبشی، ہندی، چینی، یوروپی، ملایائی وغیرہ، اسلام کے حلقہ بگوش ہیں۔ بلقان میں فرنگیوں کی قابل لحاظ تعداد مسلمان ہے۔ البانیہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہی ہے۔ یہ براعظم یورپ میں موجود ہے۔ جس علاقے میں اُنکی اکثریت ہے اس میں دجلہ فرات، نیل جیسے دریا بہتے ہیں۔ تیل کی کثیر دولت ہے۔ زرخیز زمین ہے۔ معدنیات ہیں اور وسط دنیا میں ہونے کی وجہ سے عالم اسلام تجارتی، فوجی اور معاشرتی برتری کے سارے امکانات رکھتا ہے۔

دنیا کے بڑے مذاہب میں اسلام کا درجہ بلند حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ مسلمان ہے۔ ملّت اسلامیہ کا سب سے بڑا جُز، ہندو پاکستان کے سلمان ہیں جنکی تعداد دس کرور سے زیادہ ہے۔ پھر انڈونیشیا اور ملایا کے مسلمان ہیں جنکی تعداد دس کرور سے کچھ ہی کم ہے۔ عرب نسل کے مسلمانوں کی آبادی مشرق وسطیٰ اور عرب

میں تین کروڑ سے زیادہ ہے، مصر اور سوڈان میں ڈھائی کروڑ، اور مراکش سے طرابلس تک مخلوط عرب بربر آبادی ڈھائی کروڑ ہے، افغانستان میں ڈیڑھ کروڑ اور ایران میں پونے دو کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ ترکی کے مسلمان ڈھائی کروڑ سے زیادہ ہیں۔ چین، وسط ایشیا کے روسی علاقے، ترکستان کے مسلمانوں کی تعداد بھی پانچ کروڑ کے قریب ہے۔ بلقان کے علاقوں میں ایک کروڑ کے لگ بھگ مسلمان بستے ہیں اور افریقہ کے اندرونی وسط میں اور خانہ بدوش حبشی قبائل میں تین کروڑ سے کم مسلمان نہیں ہیں۔

یہ پینتالیس کروڑ کے لگ بھگ مسلمان ایک مشترکہ اخوت، تاریخ، طرز حیات، قانون اور اخلاق کے سلسلے میں باہم پیوست ہیں، نسل و قوم رنگ و وطن کے اختلافات اپنی جگہ پر، لیکن سارے دنیا کے مسلمان ایک ہی ملت: اسلام کی ملت حنیفیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے ایسا ہی تعلق خاطر ہے گویا وہ ایکدوسرے کے بھائی ہیں دنیا کا ہر مسلمان تمام دوسرے مسلمانوں سے گہرا روحانی اور جذباتی تعلق رکھتا ہے۔

الکتابُ اللہ

اسلام کی اساس و بنیاد قرآن مجید پر ہے۔ یہ کلام الٰہی ہے جو خدا کے آخری رسول، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تیئیس سال کی مدت میں وقتاً فوقتاً اترتا رہا۔ اس میں ایک سو چودہ سورتیں ہیں اور اسکی ترتیب یوں ہے کہ شروع میں سورہ فاتحہ کے بعد بڑی سورتیں ہیں اور آخر تک پہنچتے پہنچتے چھوٹی سورتیں مثلاً: پہلی سورہ بقرہ میں ۲۸۶ آیات ہیں اور سب سے آخری سورہ ناس میں صرف ۶ آیات ہیں۔ ان سورتوں میں بعض مکی ہیں جو مکہ میں نازل ہوئیں اور بعض مدنی ہیں جو مدینہ میں نازل ہوئیں۔ مدنی سورتیں زیادہ طویل ہیں کیونکہ ان میں دعوت و تبلیغ کے علاوہ احکام شریعت بھی ہیں اور اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) پر انکی گمراہیاں اور ان کا توحید و شریعت سے روگردانی کرنا واضح کر کے ان کو سابقہ رسولوں اور انکے مقدس مشن کی یاد دلائی گئی ہے مکی سورتوں میں توحید و عبدیت پر زیادہ زور ہے کیونکہ انکے عام مخاطب اہل عرب تھے جو بُت پرست مشرک اور کسی شرعی قانون کے قائل نہ تھے۔

قرآن مجید کی یہ اندرونی ترتیب ہی سب کچھ نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات اسکا معجزہ و فصاحت ہے۔ عربی زبان کو جو ذخیرہ الفاظ، صوتی آہنگ اور اسالیب کی نزکتوں سے مالا مال ہے۔ قرآن کی زبان، الفاظ اور طرز و اسلوب نے اسے اور بلند کردیا۔ اسکی فصاحت، معانی کی بلندی اور روانی نے عام عربی ادب و شعر کے سرمایے کو انسانی دماغ کی حقیر پیداوار ثابت کر دکھایا اور خود قرآن کا یہ دعویٰ کہ ممکن ہے تو قرآن کی زبان میں کوئی ایک سورہ مرتب کرڈالو، آج بھی (چودہ سو سال گزرنے کے بعد) اپنی جگہ سب کو ساکت و حیران کردیتا ہے۔ قرآن کا یہ معجزہ ترجمے میں اپنی پوری شوکت سے ظاہر نہیں ہوتا لیکن ابتدائی عربی جان لینے کے بعد ہی قرآن کے مطالعے میں وہ لطف آنے لگتا ہے جو اسکی الہامی فصاحت کا اثر ہے اور یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ کلام انسان کا نہیں ہوسکتا، یہ خوبی آدم زاد کے کلام میں نہیں آسکتی اور بلا شبہ ظاہر و باطن کی یہ صناعی اور سجاوٹ، الفاظ و معانی کی یہ وسعت اور گہرائی اسلئے ہے کہ قرآن مجید انسان کا نہیں خدا کا کلام ہے۔

قرآن مجید کے معانی بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ انسان کا نہیں، خدا کا کلام ہے۔ اس مقدس کتاب کے مرکزی موضوع توحید و معاد ہیں۔ توحید کے بیان سے قرآن اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ کائنات کا خالق، اس کا حکمراں ایک اللہ واحد ہے۔ اسی کی خالص اور بے میل عبادت لازم و ضروری ہے وہی اطاعت و تابعداری کا مستحق ہے اور اسکی عبادت انسان پر لازم ہے۔ اس کے قانون کی تلاش اور پھر اس قانون پر عمل توحید کا مقصد ہے۔ قرآن توحید ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ معاد کا بار بار ذکر کرتا ہے اور اسکی صداقت و حقیقت کو واضح کرتا ہے معاد

عالم آخرت کے وہ نتائج ہیں جو دوسری دنیا اور روحانی زندگی کو انسان کے فانی وجود کے روبرو لاتے ہیں۔ انسانی وجود کو قران نے صرف زندگی تک محدود نہیں بلکہ موت کے بعد بھی جاری اور موجود قرار دیا ہے۔ اس عظیم حقیقت کے انکشاف سے توحید کا راستہ روشن ہو جاتا ہے کہ اللہ واحد نے صرف یہ مادی زندگی ہی نہیں، بلکہ عالم روحانیات کا وہ مرحلہ بھی خلق کیا ہے جو معاد و آخرت کہلاتا ہے۔ اس زندگی کے اچھے بُرے کاموں کے نتائج پر عالم روحانیات کے اس مرحلے میں وجود کو اچھے یا بُرے حال سے سابقہ پڑیگا جو معاد و آخرت کہلاتا ہے۔ وہ ایک طویل، ابدی زندگی کا مرحلہ ہے اور مادی وجود کے لئے اسی مرحلے کی تیاری کرنا ہے اور یہ تیاری اسی دنیا میں کرنا پڑتی ہے جو انسان کے سامنے ہے اور موت تک اسکے سامنے رہتی ہے۔

مکّی سورتوں میں توحید کی اہمیت پر بار بار زور دیا گیا ہے یہ قران مجید کی شستہ رواں، دل نشیں زبان میں خدائے واحد کے جلال و جمال کا ذکر کرتی ہیں اور اس کو جبار و قہار کی صفات کے علاوہ الرحمان اور الرحیم بھی کہتی ہیں۔ اہل مکّہ کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ اگر انھوں نے توحید و رسالت کی سمت سے اپنا منہ پھیرے رکھا تو اس دنیا میں بھی انکے لئے تباہی و نامرادی ہے اور آخرت میں بھی نقصان و خسارہ ہے۔ معاد اور آخرت سے ڈرایا گیا ہے اور مکّی سورتوں میں مصر قدیم، امت لوط (جو فلسطین کے جنوبی حصّے میں وادئ اردن بستی تھی)، حضرت نوح کی قوم (جو بالائی عراق میں بستی تھی) اور ان مشرک و منکر عرب قبائل کی تاریخ بیان کی گئی ہے جنھوں نے خدا کے رسولوں کی نافرمانی کی اور توحید و شریعت سے روگرداں رہے۔ اسی طرح یوسف علیہ السلام کے مصر میں قید رہنے اور عروج پانے، مسیح علیہ السلام کے پیدا

ہوگئے، یہودیوں کو شریعت کی دعوت دینے، داؤد و سلیمان علیہم السلام کی وسیع سلطنت الہٰیہ، اسکندر ذوالقرنین اور اصحاب کہف کی داستان مکّی سورتوں میں بیان ہوئی ہے ان کا مقصد تاریخ کو ایک نئے نقطہ نظر سے پیش کرنا ہے وہ یہ کہ توحید و شریعت کی اطاعت و ایمان نے قوموں اور افراد کو عروج بخشا جنھوں نے کفر و انکار کیا وہ انفرادی اور اجتماعی زوال کا شکار ہوکے زمانے سے مٹ گئے۔

مکّی سورتوں میں آخر یہ لب و لہجہ نرم اور بے انتہا نصیحت آمیز ہے مسلسل کفر وانکار کے روبرو بار بار یہ دعوت تکرار شدّت یقین سے پیش کی گئی ہے۔ قیامت کے دن تک مکّی سورتیں انسان کے دل و دماغ کو خدا پرستی اور قانون الٰہی کی اطاعت کرنے کے لئے بہترین سبق دیتی رہیں گی۔ ان کے مطالعے سے ہمیشہ ذہن و فکر کی اس گمراہی کا انکشاف ہوجاتا ہے جو اہل مکّہ کی طرح آج بھی کفر و انکار کرنے والوں کا سرمایہ ہیں۔ قرآن مجید کا یہی معجزہ ہے کہ اپنے نزول کے وقت اور مقامی فضا میں بھی اس نے کفر و انکار کی جو نبض شناسی کی اور توحید و معاد کے لئے جو دل نشین دلائل دئے وہ اس وقت بھی اسی طرح موزوں ہیں جیسے چودہ سو سال پہلے تھے۔ قرآن مجید آخری حجت و برہان ہے اور اسکے معانی قیامت تک تازہ و شگفتہ رہینگے یہ اسکے انداز و بیان، اسلوب اور الفاظ کی معجزانہ تخلیق کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ ہر زمانے میں رہنما ہے اور سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

○

مدینہ میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں اس مسلم معاشرے کے لئے انفرادی، اخلاقیات اور اجتماعی قانون سازی کا رنگ غالب ہے جو براہ راست رسول اللہ کے

زیر اہتمام تعمیر کیا جا رہا تھا۔ مدینہ میں ملت اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا اور اسکے قیام اسکے اصول و قوانین کے نفاذ میں خود رسول اللہ کی ذات اقدس نے بیش از بیش حصہ لیا۔ قرآن مجید کی مدنی سورتوں نے اس معاشرے کی اخلاقیات اور قانونی بنیادوں کو بیان کیا ہے جو آج بھی اسی طرح واجب العمل اور قابل تسلیم ہیں۔ مدنی سورتوں سے اسلام کی تکمیل ہوتی ہے اور توحید و معاد کے بعد قانون الٰہی: شریعت کی پابندی اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسکے کامل نفاذ کا لازمی حکم صادر ہوتا ہے۔

○

قرآن اپنی شیرینی، بلاغت اور اسلوب کے لحاظ سے بڑا اثر رکھتا ہے۔ اسکی قرأت کے آہنگ اور طرز بیان نے ہمیشہ لوگوں کو اسکی طرف کھینچا ہے، حقائق کائنات، مسائل حیات اور انسانی کردار کے لئے ضروری معیار اخلاق و روحانیت کو قرآن نے سادہ ترین طریقے پر بیان کیا ہے۔ اسکے مفہوم و معانی کو سمجھ لینا ذرا بھی دشوار نہیں اسکے مسلسل مطالعہ سے دل و دماغ پر نئے معانی کھلتے ہیں اور زندگی کی رہنمائی میں قرآن کی رہنمائی سے بہتر کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اسکو قرآن کا معجزہ کہا جاتا ہے کہ قرآن فہمی کے عام اصول سمجھ لینے کے بعد ہر درجہ کا ذہن اس سے اپنے ظرف و مزاج کے مطابق ہدایات خداوندی کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ عربی کی تھوڑی سی واقفیت کے بعد قرآن کا مفہوم سمجھ میں آنے لگتا ہے حالانکہ یہ فصیح ترین عربی میں نازل ہوا ہے مگر اس فصیح ترین عربی کو بہت آسانی سے سیکھا جاتا ہے جو قرآن کی عربی ہے اسکے الفاظ کا خاص مفہوم ہے اور ترکیبوں کا خاص رنگ ہے۔ جن کے علم کے بعد صرف قرآن فہمی کی استعداد ہی نہیں پیدا ہوتی بلکہ فصاحت کے نکتے اور اسلوب کا

لطف بھی آنے لگتا ہے۔ اسی لئے قرآن فہمی میں امداد پہونچانے کے لئے ہر زمانے میں بڑی سرگرمی سے کام لیا گیا۔ الفاظ قرآن کے مجموعے، انکے معانی اور استعمال کے اعتبار سے تیار کئے گئے۔ اسکے محاورات، طرز ادا اور ادبیت پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں۔ اسکے مستند ترجمے دنیا کی ہر زبان میں ہوئے اور اسکے تلفظ، حفظ اور اشاعت کے لئے اصول بنائے گئے، مرکز قائم کئے گئے اور جدو جہد کی گئی۔ دنیا میں جہاں کہیں مسلمان ہیں، قران انکے درمیان موجود ہے اور اسکے تلفظ، تلاوت اور اسکی تدریس میں سارے دنیا کے مسلمانوں کا طرز عمل اور ذوق و شوق ایک جیسا ہے۔

○

قران کی اعلیٰ ادبیت، خوبی اور اسکے معانی کی وسعت کو بیان کرنے کے لئے ایک علٰحدہ شعبۂ علم: تفسیر قائم ہو گیا۔ تفسیر میں قرانی الفاظ کی تحقیق، انکے معانی، طریقہ استعمال، محاورات اور قران کی آیات کی صرفی اور نحوی ترکیبوں سے بحث ہوتی ہے اور قران نے جو حکم دئے ہیں، انکی تشریح سنت الرسول کے مطابق تفصیل سے کی جاتی ہے اسکے علاوہ ہر آیت کے پس منظر میں جو امکانی معلومات ہیں وہ جمع کئے جاتے ہیں مثلاً انبیاء سابقین کے قصّوں کے نقصّوں کے بارے میں تاریخی مواد یا عرب جاہلیت کے لوگوں کے حالات ان آیات کی تفسیر میں جمع کئے گئے جن میں انبیائے سابقین کے واقعات بیان کئے گئے یا عربوں کو مخاطب کر کے ان کی جاہلیت پر انکو متنبہ کیا گیا ہے۔ تفسیر کے مطالعے اور اسکی تدریس سے قرانیات کے بارے میں علمی تحقیقات کا راستہ کھل گیا۔ اسی طرح ترجمے کے ذریعے قرآن کے مفہوم و معانی کو ان لوگوں تک پہونچایا گیا جو عربی سے ناواقف ہیں اور قرآن فہمی کے لئے ضروری عربی

بھی نہیں پڑھ سکتے حالانکہ قران فہمی کے لئے جتنی عربی ضروری ہے وہ چھ مہینے میں حاصل کی جاسکتی ہے اور یہ مسلمانوں پر فرض بھی ہے کہ وہ قرآن کو حاصل کریں۔

تفسیر کی سمت سب سے پہلے اصحاب الرسول نے توجہ کی وہ آیات و سورتوں کے معانی اور انکے اطلاق سے خوب واقف تھے اور اکثر مقامات قران کو خود رسول اللہ سے دریافت کر چکے تھے۔ خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت عروہ ابن مسعود، عبداللہ ابن عباس، ابن ابی کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن زبیر نے قران کے احوال و مواقعہ بیان کئے ہیں۔ اسکے بعد تابعین میں سے کوفہ میں عبداللہ بن مسعود کے کئی شاگرد اور مدینہ کے تابعین تفسیر کی طرف متوجہ رہے ان میں عطا ابن ابی رباح عکرمہ بن ابوالحکم، سعید بن جبیر، حسن بصری، عطا ابن سلمہ، محمد بن کعب، ضحاک بن مزاحم، زید بن اسلم، ابومالک اور عبداللہ ابن عباس کے غلام حضرت طاوس مشہور و قابل استناد ہیں۔ تبع تابعین کے زمانے میں بہت سی تفسیریں لکھی گئیں۔ ان میں سے ابن قتیبہ بن مسلم دینوری (وفات ۲۷۶ھ ہجری) نے قران فہمی کے کئی پہلوؤں پر قلم اٹھایا اور مشکل القران، آداب القراۃ اور غریب القران تین کتابیں لکھیں جن میں قران کی ترتیب، اصول احکام، تلفظ و قرات اور الفاظ و اسلوب کے بارے میں اہم معلومات جمع تھیں۔

بعد کے زمانے میں علمائے اسلام نے شان نزول، استخراج احکام، قرات و تلفظ اور الفاظ قرانی کے معانی اور محل استعمال پر خاص توجہ رکھی۔ قران فہمی میں استعداد پیدا کرنے کے لئے صرف و نحو اور عربی لسانیات کا بغور مطالعہ کیا جانے لگا۔ عربی شعر و ادب سے ذوق اور اسکی تعلیم عام ہوگئی اسکے علاوہ قران کی آیات کو مضامین

کے اعتبار سے بھی الگ الگ جمع کر کے ان سب کی شعبہ واری تفسیریں لکھی گئیں۔ قران نے ہمیشہ اسلامی تہذیب کے لئے ایک مینارہ نور کا کام دیا۔ اسکے الفاظ و معانی نے ملت اسلامیہ کے سب رشتے مستحکم رکھے، اسکو جینے کا سلیقہ اور مرنے کی ادا دونوں سکھائی کیونکہ یہ جہاد بالسیف اور جہاد بالنفس کی تعلیم دینے والا سب سے بڑا اور محفوظ صحیفہ خداوندی ہے۔

○

قران مجید کی جمع و ترتیب اور اسکی اشاعت میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں:
اصحاب رسول اور خلفائے راشدین نے جو مستعدی برتی تھی اور جلدی کی تھی، وہ اسلام کے لئے بہت ضروری تھی رسول اللہ کی ہدایات کے مطابق آیات کو سورتوں میں داخل کر کے سلسلہ وار سورتوں کو مرتب کیا جا چکا تھا۔ لیکن بہت سے لوگوں کے پاس قرآن مجید کے ایسے نسخے تھے جو انھوں نے اپنی مرضی اور آسانی کے لحاظ سے مرتب کئے تھے ـــــــ جس کو جیسے جیسے قرآن مجید سے واقفیت ہوئی تھی وہ اسکو جمع کرتا گیا تھا مگر خلافت راشدہ میں قرآن مجید کا مستند نسخہ مرتب کر کے اسکی وسیع پیمانے پر اشاعت کردی گئی اور رسول اللہ کے حکم و منشا سے مطابقت رکھنے والا نسخہ شائع ہو گیا۔ حضرت عثمان کے زمانے میں مدینہ سے قران مجید کے ایسے ایڈیشن دیارِ اسلام میں بکثرت تقسیم کر دئے گئے
یہ نسخے قدیم کوفی رسم خط میں لکھے گئے تھے۔ جس میں زیر، زبر، پیش نہیں تھے۔

لب و لہجہ کے فرق بھی عام تھے۔ اس لئے قرارت کے اصول اور علم سے کام لیا گیا اور خلافت راشدہ کے زمانے میں صحیح تلفظ اور درست لب و لہجہ سے قران پڑھانے والے بے شمار حفاظ کا تقرر کیا گیا جنھوں نے دیار اسلام میں لب و لہجہ کی بھی وحدت پیدا کردی۔ مستند لہجہ قریش کا تسلیم کیا گیا جو تمام عرب میں نفیس ترین، شائستہ عربی بولنے میں مشہور تھے اور خود رسول اللہ کا لب و لہجہ بھی یہی تھا۔ اس لب و لہجہ میں بھی سات قسم کے انداز ہیں۔ قرات سبعہ اسی کو کہتے ہیں اور یہ ساتوں قراتیں مستند مانی جاتی ہیں۔ ان سے تلفظ اور اعراب میں کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ یہ صرف مفرد حروف کے تلفظ سے تعلق رکھتی ہیں جو قرآن پڑھنے میں معانی کا فرق نہیں پیدا کرتیں، صرف مجموعی آہنگ میں فرق محسوس ہوتا ہے۔

عربی زبان میں تلفظ اور اصوات کی بڑی اہمیت ہے۔ اسلئے بہت جلد خط کوفی کی اصلاح کی گئی۔ عراق کے مشہور حکمراں حجاج ابن یوسف ثقفی (وفات ۹۵ھ/۷۱۴ء) نے اموی حکمراں عبدالملک بن مروان کے زمانے میں خط کوفی پر زیر، زبر، پیش لگانے کی ترکیب ایجاد کی۔ یہ پہلی صدی ہجری کا واقعہ ہے کہ خط کوفی میں اتنی اہم اصلاح کردی گئی۔ پھر قران کو خوبصورت طرز پر لکھنے کے بے شمار طریقے ایجاد ہوئے اور فن خطاطی نے بیحد ترقی کی اور عباسی حکمراں القاہر باللہ کے زمانے میں اسکے عالم و فاضل وزیر ابن مقلہ (وفات ۳۲۸ھ/۹۳۹ء) نے موجودہ خط نسخ ایجاد کیا۔ جس میں مزید خوبصورتی ابن بواب (وفات ۴۲۳ھ/۱۰۳۲ء) نے پیدا کی۔ فن خطاطی اسلامی تہذیب کا خاص فن رہا ہے۔ کتابوں کو حسن دینے کے علاوہ اس سے عمارتوں، ظروف، ملبوس، ہتھیار اور سامان آرائش کو بھی زینت دی گئی ہے۔ تصویر کی شرعی ممانعت نے خطاطی اور اقلیدسی

مرصع کاری کو رواج دیا اور کتاب سازی (مصاحف) ایک جلیل و جمیل فن بن گئی۔ قرآن مجید کے نسخوں کو رنگ، زینت، آرائش، حاشیہ کاری اور رسم خط کی فنکارانہ جدتوں سے برابر آراستہ کیا جاتا ہے۔

○

تفسیروں میں مرتبۂ اوّل عربی زبان کی ابتدائی تفسیروں کو حاصل ہے۔ ان میں سب سے مفصّل تفسیر، تیس جلدوں میں بڑی تحقیق و محنت سے مشہور عالم طبری (وفات ۹۲۳ء) نے لکھی۔ اسکو علم تفسیر کا معیاری نمونہ کہا جاتا ہے۔ اسکے بعد علامہ زمخشری (وفات ۱۱۴۳ء) نے صرف و نحو و ادبیات کو سامنے رکھ کر اپنی تفسیر لکھی۔ مشہور فلسفی امام رازی (وفات ۱۲۰۹ء) نے فلسفے و منطق کے رنگ میں تفسیر لکھی اور آخر امام بیضاوی (وفات ۱۲۸۶ء) نے عربی زبان میں ایک ایسی تفسیر لکھی جو عربی لسانیات، ادب، قانون و فلسفے پر مشتمل تمام سابقہ تفسیروں اور قرانیات پر تحقیقات کا نچوڑ ہے۔ اس تفسیر نے دنیا میں بڑی شہرت پائی اور اسکو جامع التفسیر کا لقب ملا۔

○

قران فہمی کے لئے مسلمانوں نے ہر زمانے میں بڑی محنت کی ہے اور اب دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر موجود ہے لیکن قرآن فہمی کے سلسلے میں علمی و تحقیقی کتابوں کا سب سے زیادہ سرمایہ پہلے عربی، پھر فارسی زبانوں میں ملتا ہے۔ اردو ان دونوں کے بعد قرانیات کے شعبے میں اپنے ذخیرے پر فخر کر سکتی ہے کیونکہ ہندستانی مسلمانوں نے اپنے آٹھ سو سالہ دور حکومت میں عربی فارسی ماخذوں سے استفادہ اٹھاکے اس علمی احسان کا حق ادا کر دیا ہے۔ اردو میں قرانیات پر بیش قیمت جدید تحقیقی کام ہوا ہے اس کے علاوہ

عربی تفاسیر کا ترجمہ بھی کرلیا گیا ہے اور فارسی سے بھی علم تفسیر پر بڑا مواد ترجمہ کے ذریعے اردو میں منتقل ہوچکا ہے۔ خود فارسی میں ملا حسین واعظ کاشفی (وفات ۱۵۰۵ء) کی تفسیر کے علاوہ علامہ تفتہ زانی (وفات ۱۳۹۰ء) کشف الاسرار اور شاہ ولی اللہ (وفات ۱۷۵۷ء) کی فارسی تفسیر و ترجمہ جیسے مستند ذخائر موجود تھے۔ شاہ عبدالعزیز (وفات ۱۸۲۰ء) کا فارسی ترجمہ و تفسیر بھی شہرت رکھتے ہیں۔ سید شریف جرجانی (وفات ۱۴۱۳ء) کے ترجمہ کو ہندوستان میں غلط طور پر شیخ سعدی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اردو میں ترجمے کی بہتر کوشش شاہ عبدالقادر (وفات ۱۸۲۳ء) اور شاہ رفیع الدین (وفات ۱۸۱۹ء) کی تسلیم کی جاتی ہے۔ ان کی وجہ سے قرآن فہمی کا ذوق عام ہوگیا۔ اسکے بعد قرآن مجید کے بہت سے ترجمے اور تفسیریں اردو میں شائع شائع ہوئیں۔ جن میں عام مقبولیت مولانا نذیر احمد (وفات ۱۹۱۲ء) اور مولانا اشرف علی (وفات ۱۹۴۲ء) کے ترجمے اور تفسیروں کو حاصل ہے۔ ان دونوں کے ترجمے اردو کی خوبی کے لحاظ سے مقبول ہوئے اور انکے حاشیئے مختصر اور اشاراتی تفسیر کا اچھا نمونہ ہیں۔ مولانا آزاد (وفات ۱۹۵۷ء) اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ترجمے اور تفسیر کو ادبی زبان اور جدید فکر و نظر سامنے رکھ کر لکھا ہے اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کی ضروریات سامنے رکھیں ہیں۔ عام اصول اسلام اور سائنس کی تحقیق سے استفادہ کرکے دونوں نے تفسیر میں بعض اجتہادی نکتے پیدا کئے ہیں۔ مولانا عبدالماجد نے ترجمے اور تفسیر کے میدان میں تفسیر ماجدی سے جدید و قدیم رنگ کا توازن قائم کیا ہے۔ اور تفسیر میں یہودیوں، عیسائیوں کے مذہبی ادب اور تاریخ و جغرافیہ اور عام فلسفے و تحقیق سے استفادہ کا راستہ کھولا ہے۔

یورپ میں قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ لاطینی میں پادری بہابنڈر نے ۱۱۴۳ء میں کیا تھا اسکے بعد پاپائے روم کے حکم خاص سے ترجمہ کو متن اور تفسیری حواشی سمیت لاطینی میں پھر ۱۵۴۳ء میں شائع کیا گیا یہ لاطینی زبان کے ترجمے علمی حلقوں کے لئے تھے اور ان سے غرض اسلامی علاقوں میں تبلیغ عیسائیت کے لئے مسلمانوں کے بنیادی عقاید سے واقفیت حاصل کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ اسلام (مسلمانوں سے دلچسپی نے یورپ کی قومی زبانوں کو بھی قرآن کے ترجموں اور تفسیروں سے بھر دیا چنانچہ ۱۶۴۸ء میں الیگزینڈر روس نے انگریزی میں اور ۱۶۴۷ء میں دی ریر نے فرانسیسی میں اپنے ترجمے شائع کئے جرمن میں شویگر نے ۱۵۴۳ء میں اپنا ترجمہ شائع کیا تھا۔ روس کی ملکہ کیتھرائن اعظم کے حکم سے قرآن مجید کو عربی متن اور روسی ترجمے و حواشی کے ساتھ ۱۷۸۷ء میں سرکاری خرچ پر چھاپا گیا ان کے علاوہ اب تک مغربی زبانوں میں بیشمار ترجمے کئے جا چکے ہیں اور خود مسلمانوں نے بھی مغربی زبانوں میں مستند ترجمے کر دئے ہیں ان میں انگریز نومسلم محمد مارماڈیوک پکتھال مرحوم، عبداللہ یوسف علی مرحوم اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ترجمے اور حواشی مستند اور قابل ذکر شمار ہوتے ہیں۔

الرسول اللہ

اسلام کا دار و مدار ان اصول و احکامات پر ہے جو خدا کی طرف سے عرب میں آخری رسول، محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کئے گئے۔ یہ ان معنوں میں سابقہ رسولوں اور انکی شریعتوں سے مماثلت رکھتا ہے کہ زمانہ سابق کی طرح اسلام بھی توحید پر اپنی دعوت (بلاوے) کا دار و مدار رکھتا ہے اور خدائے واحد کی عبادت اور اسکے قانون کی اطاعت کو نجات کا ذریعہ قرار دیتا ہے لیکن ایک بڑا فرق اسلام اور سابقہ شریعتوں میں یہ ہے کہ یہ ہمہ گیر ہے۔

اسکی ہمہ گیری کی تشریح آخری رسول محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبردست تخلیقی جدو جہد سے ہوتی ہے۔ عرب کے قدیم عقاید اور معاشرے کو یکسر تبدیل کر کے ایسے نئے تصورات و عمل کی بنیاد رکھنا آسان نہ تھا جو لازماں اور لامکاں ہوں، انکے عظیم کارنامے کو عرب قدیم کے ماحول کے پس منظر میں دیکھنے کے لئے بڑے تاریخی مطالعے کی ضرورت ہے لیکن اسلام کو سمجھنے کے لئے ایسے کسی طویل، خشک اور علمی مشغلے کی ضرورت

نہیں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دینی مشن کا مطالعہ کافی ہے اور یہی انکی پاکیزہ سیرت کا مرکزی موضوع ہے بھی، انکی تو ساری زندگی جذبے اور احساس کے اعتبار سے، فکرو نظر کے لحاظ سے اردگرد کے ذاتی حالات اور انسان سازی کے اعتبار سے خدا پرستی اور خدا دوستی پر منحصر رہی۔ اسلام کی تبلیغ و تعمیر کی ابتدا سے انکے فکرو نظر، انسان شناسی اور تخلیقی جدو جہد پر خدا پرستی کا نظریہ اور انسان کے لئے کائنات میں خدا پرستی کی شدید حاجت کا یقین غالب رہا۔ نہ صرف اس وقت جبکہ کلام الٰہی ان پر نازل ہوا بلکہ اس سے پہلے بھی وہ خدا پرستی کے طریقے، انسان کے لئے شریعت کی ضرورت اور توحید کے حامی تھے۔ کلام الٰہی کے نزول کے بعد کے زمانے میں انکی مصروفیات کا بڑا حصہ انسان سازی کے لئے وقف رہا اور انھوں نے اپنی زبردست اور غیر معمولی شخصیت کو محض اس کام کے لئے لگا دیا تھا کہ ایک مثالی نمونے کی حیثیت میں اپنی ذات کو دنیا کے لئے معیار بنادیں تاکہ لوگ خداشناسی اور شریعت کی پابندی کا سبق انکی سنت سے ہمیشہ لے سکیں۔ یہ ان کی سیرت کا نمایاں پہلو ہے۔ اسی لئے اسلام کتاب اللہ کے بعد سنت الرسول کا محتاج تسلیم کیا جاتا ہے۔ کلام الٰہی کی عملی تشریح سیرت رسول کے بغیر ممکن بھی نہ تھی۔

۵۷۱ء میں انکی ولادت مکہ کے قبیلہ قریش میں ہوئی تھی اس زمانے میں بھی مکہ، دنیا سے الگ کوئی خوابیدہ، مفلوک الحال جگہ نہ تھا۔ عرب کے بڑے مذہبی مرکز ہونے کے علاوہ یہ معاشی اعتبار سے عرب کا اہم ترین شہر تھا۔ بحیرہ روم کے ساحلی علاقوں کی تجارت میں یہ ایسی شاہراہ پر واقع تھا جو بحیرۂ ہند کی عرب بندرگاہوں کو شام، فلسطین، اور اندرون عرب سے ملاتی تھی۔ اس معاشی سرگرمی نے مکے میں تاجروں کے ایک خوشحال

طبقہ کو جنم دیا تھا۔ یہ لوگ عرب کے مذہبی قاید بھی تھے اور دولت کے باوجود ان میں
عرب کی عام بہادری، مہماں نوازی، سخاوت اور قبائل کی پرانی ذہنیت باقی تھی
ایک طرف تو ان کے تعلقات بازنطینی اور ایرانی سامراج سے تھے تو دوسری طرف
رومی سلطنت کے فلسطینی مقبوضات اور اندرونی عرب کے خانہ بدوش قبیلوں سے
تھے۔ پرانی عرب سادگی اور قبائلی روایات کو برقرار رکھنے کے باوجود اہل مکہ نے
ان تعلقات کی بنا پر دوسرے شہروں، ملکوں اور غیر عرب تہذیبوں اور مذاہب کے
بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا۔ وہ ذہانت، دانشمندی اور اخلاق میں خانہ بدوش
عربوں سے آگے تھے اور یہ خانہ بدوش عرب قبیلے اہل مکہ کی عموماً اور قبیلہ قریش کی
خصوصاً، بڑی عزت کرتے تھے۔ صنم پرست عربوں کو ابراہیمؑ بت شکن کے بنائے ہوئے کعبہ
کی حرمت و بلندی کا بھی اعتراف تھا اور مکے کے باشندے اور قریش کے قبیلے کو کعبہ
کی نگہبانی اور تولیت نے عرب میں نمایاں درجہ امتیاز دے رکھا تھا۔

شہر مکہ کی عظمت و شوکت کا ایک تاریک پہلو بھی تھا۔ یہاں وہ تمام سماجی برائیاں
تھیں، مسائل تھے، الجھنیں تھیں جو دولت والے تاجروں اور امیر بیوپاریوں پروہتوں
کے ماتحت کسی سیاسی اور معاشی نظام میں ہونی چاہئیں۔ بے انتہا امیری اور غریبی
کا فرق، غلام اور تابع افراد کا ستم سہنے والا مظلوم طبقہ اور قدم قدم پر نسل، قبیلے، خاندان
کی بنا پر اونچ نیچ کا جھگڑا، مکے کی معاشرتی فضا کی خصوصیات میں سے تھے۔ محمد صلی اللہ
علیہ وسلم نے انکو شدت سے محسوس کیا اور انکے تدارک کے لئے اسلام کے نظریۂ
مساوات سے کام لیا لیکن انھوں نے یہ کام سماجی نظام کی اصلاح کے لئے ایک محدود
انقلاب لاکے، نہیں کیا بلکہ انسانوں کو بدلنے اور نیک بنانے کی جدوجہد کی جو سابقہ

رسولوں کا طریقہ تھا اسکی بنیاد جس کلمہ پر رکھی گئی تھی۔ وہ سارے رسول بار بار انسانوں کو سنا چکے ہیں! "توبہ کرو، تاکہ نجات کا دروازہ وا ہو، ورنہ فیصلے کا دن نزدیک ہے۔"

مکے میں کلام الٰہی کے نزول کے بعد رسول اللہ کی جدو جہد میں ان لوگوں نے دل و جان سے شرکت کی جو طرز حیات اور نظام زندگی میں یکسر تبدیلی کی خواہش رکھتے تھے اور اسلام پر صدق دل سے ایمان لائے تھے کہ یہ مادی زندگی اور روحانی مسائل کا واحد علاج بتانے والا دین خدا پرستی ہے۔ مکے میں اسلام کی شدید ترین مخالفت ہوئی۔ اسلام قبول کرنے والوں پر مظالم کئے گئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ تکالیف پہونچائی گئیں یہاں تک کہ آپ کی جان لینے کا منصوبہ باندھا گیا۔ اہل مکہ کے اس طرز عمل اور کفر و انکار کے اسباب معاشی اور سیاسی زیادہ تھے وہ جانتے تھے کہ اسلام کے قبول کرنے کے معنی ایک ایسے مذہب کے قبول کرنے کے ہیں جو انکو نہ تو پجاری پروہت رہنے دیگا نہ انکی امتیازی درجہ بندیوں کو برقرار رکھے گا۔ ان کی بے قید آزاد حاکمانہ زندگی پر عقیدے اور عمل کی پابندیاں عاید ہوں یہ وہ گوارا نہیں کرسکتے تھے، اسلئے انھوں نے اسلام پر دو سب سے بڑے اعتراض یہ کئے کہ ایک تو یہ آخرت میں جزا و سزا کا قائل ہے دوسرے پرانے خاندانوں کے مقدس افراد کو عام لوگوں اور غلاموں کے برابر کردیتا ہے۔ انکا سابقہ مذہب انکے مفادات کے مطابق تھا۔ چند بتوں کی پوجا کے بعد کسی قانون کو ماننے کی حاجت نہ تھی کسی شریعت پر چلنا ضروری نہ تھا۔ اور پھر یہ تین سو ساٹھ بت اہل مکہ اور قریش کے قبیلے کو عام انسانوں سے بلند و برتر بنانے والے مذہب کے خدا تھے۔ اسلام نہ تو اہل مکہ کی پیدائشی بلندی کا قایل تھا نہ بے قید نفس پرستی کو روا رکھتا تھا اسلئے ان کے لئے ناقابل قبول تھا۔

اس کفر و انکار کو متواتر دس سال تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ اور عام تبلیغ کے ذریعے ایمان سے بدلنے کی کوشش کی۔ دس سال میں انکے گرد ایمان والوں کا ایک مختصر سا گروہ جمع ہوگیا۔ اب تک اہل مکہ نے قبائلی روایات کے مطابق رسول اللہ کی جان پر حملہ کرنے کی بات اس لئے نہ سوچی تھی انکو قریش کی جوابی کارروائی کا اندیشہ تھا کہ وہ اپنے ایک فرد کے خون کا بدلہ لینے کے لئے اُٹھ کھڑے ہونگے اب شہودِ دشمن اسلام، ابوجہل نے یہ ترکیب کی کہ مکّے کے تمام قبائل سے ایک ایک آدمی لے کے ایک گروہ تیار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنے کا منصوبہ باندھا۔ ابوجہل جانتا تھا کہ تمام قبیلوں کے ایک ایک فرد کی شرکت کے بعد، قریش کے لئے یہ ناممکن ہوگا کہ وہ مکّے کے تمام قبائل سے خون کا بدلہ لینے کی کوشش کریں۔

یہ حملہ ہونے سے قبل رسول اللہ کو حکم خداوندی سے اسکی خبر ملی اور اس کے ساتھ مکّہ سے ہجرت کرنے کا حکم بھی ملا اور ابوجہل کی ترکیب ناکام ہوگئی۔

○

مکّہ سے دو سو میل دور شمالی سمت میں یثرب کے شہر نے رسول اللہ کی خدمت میں قاصدوں کے ذریعے یہ درخواست کی کہ آپ وہاں تشریف لائیں۔ یثرب پر اس وقت وہاں کے دو قبیلوں کی باہمی جنگ کی وجہ سے کمزوری اور انحطاط غالب تھا اور اسکی معاشی زندگی پر یہودی عرب قابض تھے اور اب تو یثرب پر ایک نوعیت کا سیاسی اقتدار بھی ان یہودیوں نے کرنے کے لئے اقدامات شروع کردیئے تھے۔ اسلام کی دعوت میں اہل یثرب کو باہمی اتحاد اور مساوات کی روشنی ملی اور انھوں نے رسول اللہ کو اہل ایمان کے گروہ سمیت یثرب آنے اور وہاں بس جانے کی دعوت دی۔ یہ دعوت بڑے خلوص

اور پوری ایمانداری سے دی گئی تھی اور آخر ۶۲۲ء میں رسول اللہ نے اہل ایمان سمیت مکے سے ہجرت فرمائی۔

ہجرت کو تاریخ اسلام و شریعت اور سیرت رسول میں ایک خط امتیاز کا درجہ حاصل ہے۔ یثرب پہونچنے کے بعد اسلام نے تیزی سے ترقی کی، قوت حاصل کی اور عملاً اس کے عقاید نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اپنے قالب میں ڈھالنا شروع کیا۔ یثرب۔ جو مدینۃ الرسول کہلایا، اسلام کی پہلی منظم بستی تھا جہاں اسلامی سماج بنا، قانون کا نفاذ ہوا اور اسلامی حکومت خود رسول اللہ کی ذات مبارک کی قیادت میں وجود میں آگئی۔ مدنی تمدن اسلامی تہذیب کی پہلی منزل تھا۔ یہاں اسلام کی انقلابی تحریک نے ایک ایسی شکل اختیار کی جو اب تک صرف ذہن و خیال میں تھی، مدینہ میں اسلامی معاشرہ تشکیل پایا جسکی رہنمائی خود رسول اللہ کے ہاتھ میں تھی، سیاسی نظام ترتیب دیا گیا اور رسول اللہ نے ملت اسلامیہ کے حاکم اور خلیفہ کے فرائض ادا کر کے خلافت اسلام کیلئے آنے والے زمانے میں طرز حکومت اور مقصد حکومت کی وہ سنت چھوڑی جسکو خلفائے راشدین نے اپنا راہ نما بنایا۔ اسلامی قانون سیاسی میں آج بھی معیاری نظام، یہی "خلافت علیٰ منہاج نبوت" (رسول کے طریقے کے مطابق خلافت) معیار اور کسوٹی ہے۔ مدینے نے اسکی ابتدا، قیام، نشو و نما کے لئے اپنی زمین اپنے با ایمان باشندے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر کئے تھے۔

○

مدینہ میں جو مسلم معاشرہ بنا اس میں انصار (مقامی باشندوں) کے خلوص اور اسلام دوستی نے بڑا کام کیا۔ انھوں نے مہاجرین (مکہ سے آنے والے مسلمان) کو اپنے میں جذب

کرنے اور ایک ہونے کی کوشش کی۔ رسول اللہ نے کہا تھا کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ مدینہ میں یہ اخوت ہر عمل میں ظاہر ہوئی انصار نے مہاجروں کے لئے گھر بار جائداد، کاروبار، ہر چیز کو دو حصوں میں بانٹ دیا ایک حصہ اپنے لئے رکھا، ایک اپنے بھائیوں، مہاجرین کو دیدیا۔ اس طرح مدینہ میں وہ مسلم معاشرہ وجود میں آیا جس کا ہر جزا اپنے کل سے پیوستہ تھا۔ یہ اتحاد اور مرکزیت مدینہ کے دور میں عروج پر آئی۔ یہاں رسول اللہ نے اسلام کے قانون کو رفتہ رفتہ رائج کرنا بھی شروع کردیا تھا اسطرح شریعت کے نفاذ نے مدینہ کو ایک ایسی بستی بنادیا جو عرب کے بے قید وحشی ملک میں تمدن تہذیب کے آثار و برکات سے معمور ہوا اور یہ تہذیب و تمدن اس دین مقدس اسلام کے آفریدہ تھے جسکو ابھی مدینہ سے نکل کے ساری دنیا میں تہذیب کی روشنی پھیلانا تھا اور زمین کے بعید ترین گوشوں تک خدا دوستی اور شریعت کے احترام کا نظام حیات قائم کرنا تھا۔ رسول اللہ نے اسلام کی آنے والی صدیوں کے لئے اسلامی تحریک کے رخ، طریقہ کار اور اسکی تعمیر و قیادت کی ساری تعلیم مدینے میں اپنی تخلیقی و تعمیری جدو جہد سے دی ہے اسی لئے سیرت رسول میں مدنی زندگی کا مطالعہ سیرت کا اہم ترین حصہ ہے۔ مکّہ میں رسول اللہ کی زندگی توحید و رسالت پر ایمان لانے کی دعوت کی داستان ہے لیکن جب تبلیغ سے غافل دلوں پر اثر نہو، سمجھانے سے نیکی بدی کا فرق سمجھ میں نہ آئے اور روایات و عقاید کی گمراہیاں، حق کے قبول و اطاعت میں مانع رہیں تو پھر حق کے لئے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں رہ جاتا کہ تخلیقی جدو جہد کا رخ بدل دیا جائے اور وہ مرحلہ آجاتا ہے جب جہاد کے سوا کوئی راستہ کھلا نہیں رہتا۔

مدینہ میں رسول اللہ مسلم معاشرے کی تعمیر میں منہمک تھے۔ قانون سازی کی جارہی تھی اور عبادات و معاملات کے لیے اصول نافذ کئے جارہے تھے کہ اچانک ایک اندرونی دشمن نے بیرونی دشمن سے ساز باز کرکے جہاد کا راستہ کھول دیا۔ یہودیوں نے جو مدینہ کے قرب وجوار میں بڑی طاقت رکھتے تھے، مدینہ کے مسلم معاشرے کے خلاف اہل مکہ سے ساز باز کرلیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

انصار و مہاجرین کی متحدہ قوت نے اس مشترکہ حملے کو نہ صرف روکا بلکہ پہلے خندق اور خیبر کے غزوات میں یہودیوں کی فوجی طاقت ختم کردی اور پھر ۶۳۰ء میں مکہ بھی فتح ہوگیا۔ اسکے بعد ڈھائی سال تک رسول اللہ نے پورے عرب کو قانون اسلام کے تحت منظم و مرتب کیا اور ہمسایہ ممالک، ایران، روم، مصر اور حبشہ کے بادشاہوں کو قبول اسلام کی دعوت دی۔ یہ اسلامی معاشرے کے استحکام اور اسلامی مملکت کے اوّلیں قیام کا زمانہ تھا اور ۶۳۲ء میں رسول اللہ کی دنیاوی حیات کے خاتمے کے ساتھ ختم ہوگیا۔ آپ کی وفات کے بعد اسلام نے کتاب اللہ اور سنت الرسول کے طے کئے ہوئے راستوں پر چل کے عرب وعجم پر توحید و شریعت کے پرچم بلند کئے اور خلافت راشدہ کے زمانے میں اسلام ساری مہذب اور متمدن دنیا میں پھیل گیا۔

رسول اللہ کی زندگی کو اسلام میں مرکز اور مثال کی جگہ دیجاتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے پیام اور کام کو دنیا میں پھیلانے اور قائم کرنے کا طریقہ کار سیرت رسول کے مطالعے ہی سے سمجھ میں آتا ہے۔ مکی زندگی میں آپ نے جس طرح سخت مخالف حالات میں حق کی تبلیغ کی، بے پناہ تکلیفوں کا سامنا کیا اور بار بار اخلاقی و روحانی

قدروں کی طرف اپنے شدید دشمنوں کو بلایا، وہ مکّی زندگی کے روشن پہلو ہیں۔ ان سے یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ اسلام کی تبلیغ شدید مخالف حالات اور مصیبتوں میں بھی فرض ہے اور خدا کی راہ میں سرگرم ہونے والوں کو نتائج کی پرواہ کئے بغیر حق کی تبلیغ جاری رکھنا چاہیئے۔ ہجرت کا واقعہ مکی زندگی کا آخری باب ہے۔ یہ حق کی خاطر وطن و قوم عزیز و اقارب، کو خیرباد کہہ دینے کا سبق دیتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے لئے اصل اہمیت اسلام کی ہے۔

○

مدنی زندگی میں آپ نے اسلام کے قانون کو نافذ فرمایا تھا۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کے احکامات کو درجہ بہ درجہ نافذ کیا گیا اور ان پانچ اصولوں سے ایک ملت کی تعمیر کی گئی۔ سود، شراب، قمار بازی، ناپاک جانور، حرام کئے گئے۔ جنسی معاملات میں پاک بازی اور سماجی قانون کے احترام کو فرض کیا گیا۔ نکاح اور طلاق کے اصول بنا کے عورتوں کا درجہ بلند کیا گیا اور ان کو حقوق دیئے گئے۔ والدین اور عزیزوں کے حق، ہمسایوں اور مسلمان بھائیوں کے حق کا تعین کیا گیا اور زندگی کے تمام معاملات میں خدا ترسی، نرمی اور نیکی سے کام لینے کا حکم دیا گیا، مدینہ کی شہری ریاست کا مثالی معاشرہ اسلام کا پہلا عملی نمونہ تھا۔

مدنی زندگی سے رسول اللہ کی سیرت مبارک کا روشن ترین پہلو سامنے آتا ہے آپ نے حکمراں، فیصلہ کرنے والے اور قانون نافذ کرنے والے کی حیثیت سے ایک طرف قوانین اسلام کو پوری مضبوطی سے قائم کیا تو دوسری طرف رحم کرم، انسان نوازی محبت اور نرمی سے کام لیا، ذاتی دشمنوں کو معافی دی۔ لوگوں کو صبر و تحمل کی تعلیم دی اور

اسلام کے مخالفوں کو نرمی اور محبت سے سمجھا کے مسلمان کیا۔ وہ عرب جو بیحد جنگجو، بدمزاج اور آزاد طبع تھے، رسول اللہ کی تعلیم و تربیت سے نیک نفس، متحمل مزاج اور قانون اخلاق و روحانیات کے تابع ہو گئے۔ سماج ہی نہیں بدلا، بلکہ افراد بھی بدل گئے۔ کردار و مزاج بدل گئے۔

رسول اللہ کی ذاتی اور نجی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ عرب کے ماحول میں خداترسی، پاکبازی، نرمی اور رحم دلی کی یہ زندگی خدا کی ہدایات کا بہترین نمونہ تھی آپ نے اپنی غیر معمولی شخصیت سے اس دور میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اپنے وطن اور قوم میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کر دیں اور رنگ و نسل، قوم و وطن کے بت مسمار کر کے عالم انسانیت کو ایک وحدت سمجھنے کا سبق دیا۔ عربوں کی نسل پرستی اور تعصب کا خاتمہ کر دیا اور فرمایا: "تم میں سے وہی شخص خدا کے نزدیک اچھا ہے جو خدا سے تقویٰ کرتا ہو۔"

خدا سے تقویٰ (احساس ذمہ داری سے خوف محسوس کرنا) کا عالمی پیام دینا سیرت الرسول کا سب سے بڑا پہلو ہے۔ خدا کو واحد، با اختیار تسلیم کرنا ہو، یا اسکی پرستش کرنا، اسکے قانون پر عمل کرنا ہو یا اسکے حکم کی اطاعت کرنا، ہر چیز کے پیچھے تقویٰ ہی جلوہ گر ہوتا ہے۔ رسول اللہ نے دنیا کے انسانوں کو تقویٰ کا راستہ دکھایا اور یہ راستہ اسلام کا مکمل نظام حیات ہے جو آپ کے ہاتھوں عرب میں قائم ہوا پھر دنیا میں پھیلا، قیامت تک کیلئے یہی وہ نظام حیات ہے جو سیدھے راستے کے نام سے خود خدائے تعالیٰ کو پسند ہے اور سیرت الرسول سے روشنی لینا اس پر چلنے کے لئے لازم ہے کیونکہ تقویٰ اور سیرت الرسول لازم و ملزوم چیزیں ہیں ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے کو سمجھے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔

احکام قرآن

قرآن مجید عقاید و شریعت کا سرچشمہ ہے۔ اسلامی تہذیب نے اپنے ارتقا کے ہر دور میں اسی سے کائنات، انسان اور اسکے طرز حیات کے معیار مقرر کئے اور قانون سازی کے لئے اسکو رہنما مانا۔ اسلام کے بنیادی عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ قرآن مجید کو ہادی و رہنما تسلیم کیا جائے اور انفرادی و اجتماعی زندگی اس کے احکام و تعلیم کے مطابق، نئے سانچوں میں ڈھالی جائے۔

قرآن نے عقیدے اور قانون کے وسیع اصول نافذ کئے ہیں جو تمدن اور اس کے معاشی و سیاسی نظام کے مادی ارتقا سے تصادم نہیں رکھتے۔ یہ عقاید و اصول ازلی و ابدی ہیں۔ انکی شکل و صورت اور انکے مزاج و روح کو تمدنی مرحلے کی ہر ضروریات کے مطابق اختیار کیا جا سکتا ہے قرآن مجید انسان کے مادی ارتقا کی ہر منزل کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالتا ہے جو سراسر خیر ہو اور تمدن و تہذیب کے ذہنی و عملی شر سے مبرا و پاک ہو۔ اپنی تعلیم کی اس عمومیت اور وسعت کی بنا پر یہ عالم انسانیت کیلئے

ہر زمانے، ہر ماحول، ہر مرحلے میں فلاح و خیر کی گرمی اور روشنی کا مرکز ہے۔ قرآن لازوال و ابدی حکم و تعلیم ہے۔

قرآن مجید کی تعلیم و ہدایت کا آغاز عقاید کو پاک و صاف کرنے سے ہوتا ہے اس میں سب سے پہلے توحید کی تعلیم ہے اور اللہ واحد کی پرستش و اطاعت کے احکام ملتے ہیں۔ دنیا میں انبیا علیہ السلام نے ہمیشہ یہی تعلیم دی تھی۔ لیکن شرک نے اس تعلیم کو دھندلا کیا اور کفر نے اس سے انکار کر کے پستی اختیار کی۔ قرآن مجید الہ واحد، الرب العالمین کی طرف بلاتا ہے جو پوری کائنات کا خلق کرنے والا، اسکا مالک و حاکم، معیار خیر و شر کا ناطق فیصلہ کرنے والا اور انسان و انسانیت کا آخری و قطعی منصف و حاکم ہے۔

اس یکتا و بے ہمتا ذات مطلق کی تعریف قرآن مجید نے ایک اسم خاص: اللہ سے کی ہے اور اسکی عظمت کو ذہن انسانی تک پہونچانے کی خاطر اسکو ننانوے اسمائے حسنہ (اچھے ناموں) سے یاد کیا ہے۔ یہ اسکی ذات مطلق کی وسعت و عظمت کی سمت اشارے ہیں۔ ان میں اسکی وہ صفات جھلکتی ہیں جو انسان کے لئے رحمت و پناہ ہیں۔ اسمائے حسنہ سے اسکی قدرت و حکمت کی طرف ذہن جاتا ہے۔ قرآن مجید انکو ذات مطلق کے اسم خاص: اللہ کی تعریف و تشریح کے لئے استعمال کرتا ہے مگر توحید جو قرآن کا اصل پیام ہے وہ صفات خداوندی میں سے کسی صفت کی پرستش کا نام نہیں بلکہ ذات خداوندی کی پرستش و اطاعت کا نام ہے۔ اس اسم خاص: اللہ کے معانی حاکم، فرماں روا، مالک، آقا، قابل پرستش اور واجب اطاعت کے ہیں۔

قرآنی توحید کا معیار آیت الکرسی (سورہ بقر آیت ۲۵۶) سے سمجھا جا سکتا ہے۔

"اللہ وہ ہے کہ کوئی معبود اس کے سوا نہیں، وہ زندہ ہے، سب کا سنبھالنے والا ہے، نہ اُسے اونگھ آسکتی ہے نہ نیند، اسی کی ملکیت ہے جو کچھ زمین و آسمان میں ہے، کون ایسا ہے جو اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے سفارش کر سکے، وہ جانتا ہے جو کچھ مخلوقات کے سامنے ہے اور جو کچھ انکے پیچھے ہے اس سب کو، اور وہ اس کے معلومات میں کسی چیز کو بھی نہیں گھیر سکتے سوا اس کے جتنا وہ خود چاہے، اس کی کرسی نے سما رکھا ہے آسمانوں اور زمین کو اور اُس پر اس کی نگرانی ذرا بھی گراں نہیں ہے، وہ عالی شان ہے اور عظیم الشان ہے۔"

قرآن نے عبد کو یہ بھی بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف حکمراں و مالک ہی نہیں، بلکہ عادل و رحمان و رحیم بھی ہے۔ وہ حاضر و ناظر بھی ہے رگِ جاں سے بھی قریب ہے اول و آخر ہے اور ظاہر و باطن ہے الغرض کائنات میں اُسکی قدرت و گرفت کے پہلو بہ پہلو اسکی مہربانی اور کرم بھی موجود ہیں۔ سورہ نور کی آیت ۳۵ میں کہا گیا ہے۔

"اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور ہدایت کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک طاق ہے، اس میں ایک چراغ ہے، چراغ قندیل ہے، اور قندیل گویا ایک چمکدار ستارہ ہے، چراغ روشن کیا جاتا ہے ایک نہایت مفید درخت یعنی

زیتون سے جو نہ پورب رُخ ہے نہ پچھم رُخ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اُٹھے گا اگرچہ کہ آگ اسے نہ چھوئے، نور ہی نور ہے، اللہ اپنے اسی نور کو جس تک چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اور اللہ لوگوں کے لئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کا بہتر جاننے والا ہے۔"

سماوات وارض کے اس نور: اللہ تعالیٰ کو ہر طرح کی قدرت حاصل ہے۔ وہی ایسا ہے جسکی پرستش روا ہے۔ شرک کرنا، اسکے انکار کی طرح بدترین جرم ہے کیونکہ شرک کرنے والے اسکی صفات سے انکار کرتے ہیں اور فانی بے طاقت اور خود اللہ تعالیٰ کی محتاج مخلوقات سے حاجت روائی چاہتے ہیں۔ اور ان کی منشا و مرضی کی اطاعت کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے توحید پرستوں کے لئے صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اسکے قانون ومشیت کی اطاعت جائز رکھی ہے۔

یہ قانون انبیاء علیہم السلام کے ذریعے انسانوں کو ملتا رہا ہے۔ عقاید، قانون اور طرز حیات کو وحی کے واسطے سے نازل کیا گیا۔ الہامی کتابوں کو قانون و طرز حیات کا مرکز بنایا گیا۔ رسولوں نے اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ خدائی قانون سے انکار کرنے والے نہ صرف یہ کہ معاد و آخرت میں سزا پائیں گے بلکہ اس دنیا میں بھی عذاب میں گرفتار ہو کے تباہ و برباد ہونگے۔ قرآن مجید میں (۲۸) پیغمبروں کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے چار خاص عرب کے تھے، اٹھارہ یہودیوں کے، تین: حضرت مسیح، ذکریا اور یحییٰ علیہم السلام وہ ہیں جنکو عیسائی خصوصیت سے مانتے ہیں اور دو کی طرف انکے القاب

سے اشارہ کیا گیا ہے۔ ان سب نے ایک ہی بات کی تبلیغ کی تھی وہ یہ کہ خدا ایک ہے۔ اسی کی بندگی کرنا چاہیے۔ اسی کے قانون کو تسلیم کرنا چاہیے ورنہ آخرت میں سزا ملے گی اور دنیاوی زندگی عذاب کا شکار ہو کے بگڑے گی اور تباہ ہوگی۔ خدا کے حکم سے ان ۲۸ رسولوں نے انسانوں کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے قانون، معیار اخلاق اور طرز حیات کی تربیت دی اور درجہ بدرجہ بدلتی ہوئی دنیا کے حالات کے مطابق خدائی قانون کے اصول و تفصیلات بیان کیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو تورات داؤد علیہ السلام کو زبور، مسیح علیہ السلام کو انجیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کے نزول سے خدائی ہدایات ملی ہیں۔ یہ سب احکامات خداوندی کی حیثیت میں برابر ہیں لیکن قرآن مجید سب سے آخری شریعت کا صحیفہ ہے جو مکمل اور موجود ہے۔ دوسری کتابوں کو تحریف کے ذریعے بدل دیا گیا اور اب انکے قانون اپنی تمام تر تفصیل میں قرآن مجید نے منسوخ کر دئے۔

قانون کے اس آخری صحیفے: قرآن مجید نے جو حقائق بیان کئے ہیں مثلاً: توحید معاد، جنّت، جہنّم، فرشتے اور انکی عبادت، ابلیس اور اسکی نافرمانیاں، ان سب کو تسلیم کرنا چاہیے۔ یہی ایمان بالغیب ہے کہ ان دیکھی چیزوں کو اس لئے حقائق سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام اور رسول اللہ کے بیان سے ان کا وجود ثابت و معلوم ہوتا ہے۔

○

ایمان لانے کے لئے کلمہ شہادت کافی ہے جس کے معانی میں یہ سب باتیں پوشیدہ ہیں۔ پھر قرآنی احکامات پر عمل کرنا ضروری ہے جن میں پہلا درجہ عبادات کا ہے

انکو ارکان اسلام بھی کہتے ہیں۔ یہ پانچ اصول ہیں۔
الصلوٰۃ : دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھنا چاہیئے۔
الزکوٰۃ : سال بھر میں اپنے مال سے ڈھائی فیصد رقم ادا کرنی چاہیئے۔
الصّوم : سال میں رمضان بھر ایک ماہ روزے رکھنا چاہیئے۔
الحج : } ان دونوں فرائض کے لئے استطاعت شرط ہے لیکن
الجہاد : } یہ بھی بنیادی فرائض میں داخل ہیں۔

عبادات کو حقوق اللہ بھی کہا جاتا ہے انکے بعد حقوق العباد ہیں وہ باتیں ہیں جن کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے۔ ان میں ماں باپ، آل اولاد، نوکر غلام، پڑوسیوں، محتاجوں اور تمام مسلمانوں کے وہ حقوق ہیں جن کو ادا کرنا چاہیئے۔ میراث، عدل و انصاف کا سلوک، ہمدردی، مساوات برتنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ جرائم کی سزائیں مقرر کردی گئی ہیں۔ زنا، شراب اور قتل کو بڑے جرم قرار دیا گیا ہے۔ اخلاقی معیار قائم کرکے جھوٹ بولنے، دھوکہ دینے، غلط وزن بتانے، کسی کا مال ہضم کرنے پر خدا کی لعنت کی گئی ہے۔

اسکے علاوہ حلال وحرام کے حکم میں سور کا گوشت، بہتا ہوا خون، اور مرے ہوئے حیوان کا کھانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ سود کا لینا دینا، خدا کے علاوہ کسی کے نام پر ذبح کیا جانور کھانا، حرام کیا گیا ہے۔ نکاح، طلاق، لین دین، تجارت، عبادت سب کے لئے واضح طور پر بعض خرابیوں کی نشان دہی کرکے انکو حرام قرار دیا گیا ہے ان سے بچنے لازم ہے۔

قرآن مجید کی جن آیات سے براہ راست حکم و قانون صادر ہوا ہے ان کو قانون

اسلامی کے ماہروں نے ڈیڑھ سو مانا ہے اور آیات کے قرینے، بلاغت اور اسکے معانی سے استنباط کر کے جو احکامات و اصول قانون دانوں نے نکالے ہیں ان کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے۔ ان میں قانون کا درجہ بدرجہ ارتقا ہوا ہے اور جن آیات نے کسی حکم کو مکمل و آخری شکل دی ہے انکو ناسخ کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ انھوں نے سابقہ آیت کے معانی کو وسیع تر کر دیا اس لئے اس کے محدود معانی منسوخ مانے جانے لگے۔ آیات کے احکامات کی تین قسمیں مانی جاتی ہیں۔

فرض۔ وہ احکام ہیں جن میں براہ راست کسی بات کو کرنے نہ کرنے کا حکم ہو۔ ایسی آیات میں عربی کا صیغہ امر استعمال ہوا ہے۔ یا ان کو مسلمانوں پر ایک فرض قرار دیا گیا ہے۔ ان پر عمل لازمی ہے۔

واجب۔ جن احکامات میں کسی بات کو کرنے کا حکم تو نہیں، مگر آیات میں ان کے نہ کرنے سے دین یا دنیا کے کسی نقصان کا ذکر ہے، اس کے کرنے کی تعریف ہے، اسکو کرنے سے ثواب ملنے کا ذکر کیا گیا ہے تو اس پر عمل کرنا بہر حال واجب ہے اور اگر آیات میں کسی حکم پر تاکید نہیں صرف اچھی بات میں اس کا شمار ہوا ہے تو اس کو مندوب کہتے ہیں۔ اس کے اوپر عمل کرنے یا نہ کرنے سے دنیا یا آخرت کا عذاب نہیں ہے۔

حرام۔ جن احکامات میں کسی بات کو حرام کہا گیا۔ ان کی ممانعت کی گئی، اسکو ناپاک کام کہا گیا، اس کے کرنے سے عذاب کی خبر دی گئی اسکے کرنے والے کی مذمت کی گئی، کسی خرابی کا سبب ٹھیرایا گیا اور اسکو

اپنی ناراضی کا سبب بتایا گیا تو یہ حرام ہے اس پر عمل کرنے سے سخت گناہ ہوگا احتراز ضروری ہے۔

قرآن مجید کے احکامات فرض، واجب اور حرام و حلال کو عملاً ماننا ایمان کے لئے ضروری ہے۔

○

آیات احکام سے قانون کے عام اصول اور پھر انکی تفصیلات مرتب کی گئی ہیں۔ اصول فقہ کا علم اس لئے ایجاد ہوا ہے، یہ دنیاوی معاملات کے اصول اور تفصیل میں قانون بنانے کا علم ہے تاکہ قرآن مجید کے احکامات کے مطابق مسلمان خدا کے حکم و منشا کی مکمل اطاعت کریں۔ اس سلسلے میں دو مشہور کتابیں علامہ ابوبکر محمد بن العربی اندلوسی (وفات ۱۱۴۸ء) کی احکام القران اور علامہ احمد بن علی الجصاص (وفات ۹۸۰ء) کی احکام القرآن ہیں۔ اسی طرح آیات عقائد کی تشریح کر کے ان کو اصولی اور تفصیلی طور پر واضح کیا گیا جو علم عقاید کا موضوع ہیں۔

قرآن مجید عقاید و قانون کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے اسکے احکامات ازلی اور ابدی ہیں، جو بنیادی باتیں آیات کے واسطے سے صاف صاف بیان کر دی گئی ہیں، وہ قیامت تک حجت ہیں۔ ان میں ترمیم و تنسیخ نہیں کی جا سکتی۔ عقاید و عبادات ہوں یا معاملات و قانون، قران مجید کے بنیادی اصول ہر وقت، ہر زمانے کے لئے آخری اور قطعی حکم ہیں۔ البتہ علم عقاید اور علم فقہ کے شعبوں میں ترقی ہوتی رہتی ہے اور قران مجید کی آیات کو سمجھنے سمجھانے میں جدید معلومات اور تازہ علم سے برابر کام لیا جاتا ہے اجتہاد کے یہی معنی ہیں کہ قرآن مجید کے عقاید و قانون کو ماحول اور وقت کی ضروریات

و مسائل کی الجھنوں اور خرابیوں کو دور کرنے کے لئے اختیار کیا جائے کیونکہ انسان کی پوری زندگی کے تمام گوشوں پر قران مجید نے ہدایت و رہنمائی کی ہے جس سے فائدہ اٹھانا انسان کے اپنے بس میں ہے' یہ خدا کی کتاب ہے لیکن اسکو نازل انسانوں کے لئے کیا گیا جو قانون اور عقیدے کے لئے اپنی عقل کو ہمیشہ ناکافی پاتے ہیں اور اپنے دل میں خدا کے قانون اور درست عقیدے کے لئے ہمیشہ ایک کشش جستجو اور تمنا محسوس کرتے ہیں۔

قرآن مجید ان کے لئے راہ ہدایت ہے۔ اس کے قانون سے دنیا میں بہترین معاشرہ قائم ہوتا ہے بہترین انسان بنتے ہیں اور آخرت میں خدائے واحد کی خوشنودی حاصل کرنے اور نجات پانے کا ذریعہ اسی کی اطاعت اور اس پر ایمان لانے میں ہے۔

○

قرآن کے قانون اساسی کا مقصد نوع انسانی کو مخلوقات کے قانون سے آزاد کرنا ہے تاکہ وہ ایک اعلیٰ نظام حیات کے تحت روحانی اور مادی زندگی کو سنوار سکیں یہ نظام حیات وحی الٰہی کے ذریعے انسانوں کو عطا ہوا ہے اور ان کو سب کی بندگی سے آزاد کرکے کائنات کے واحد رب والہ کی عبادت وعبدیت کے راستے پر لاتا ہے۔ قرآن نے خود انسان کو دعوت دی ہے کہ وہ اپنی زندگی، اسکے مقصد اور مخلوقات کی غلامی میں مبتلا ہونے کو دیکھے اور عبرت حاصل کرے کہ وہ آزاد پیدا ہوا ہے لیکن اسکو خود اس کے جیسے انسانوں نے اپنا غلام بنالیا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّ کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں، زبان، دو ہونٹ نہیں دئے

شَفَتَيۡنِ وَهَدَيۡنَاهُ النَّجۡدَيۡنِ فَلَا اقۡتَحَمَ — اور بھلائی برائی کے راستے اسکو نہیں دکھائے پھر بھی وہ
الۡعَقَبَةَ وَمَا أَدۡرَاكَ مَا الۡعَقَبَةُ فَكُّ — نیکی تنگ گھاٹی سے ہو کے نہیں نکلا اور تمھیں معلوم ہے
رَقَبَةٍ — وہ گھاٹی کیا ہے؟ گردن کو غلامی سے آزاد کرنا۔

یہی فَکُّ رَقَبَةٍ : گردن کو غلامی سے آزاد کرنا وہ منزل ہے جو احکام قرآن پر عمل سے انسان کو نصیب ہوتی ہے اسکا رشتہ ماسوا سے کٹتا اور اللہ واحد سے جڑتا ہے اور ایسے انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے خلافت ارض کا وعدہ کیا ہے۔

قرآن کے اساسی قانون نے تمام انسانوں کو مساوی اور برابر کا قرار دیا ہے۔ اللہ واحد کے بندے ہم رتبہ ہوتے ہیں

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ — اہلِ ایمان آپس میں بھائی ہیں۔

ان کے حقوق و فرائض ایک جیسے ہیں۔ خدا کے قانون کے سامنے انکا رتبہ یکساں ہے ان کو ایک دوسرے پر کوئی ترجیح نہیں، اور اگر ہے تو انکے لئے جو تقویٰ: خدا کے خوف سے اپنے فرائض دینی ادا کرنے کے جذبے سے زیادہ مالا مال ہیں۔

اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰکُمۡ — اللہ کے نزدیک بڑا وہ ہے جو زیادہ تقویٰ برتتا ہے۔

یہ اجتماعیت کا وہ نظریہ ہے جس نے خلافت اسلامیہ کی شکل میں آزادی، مساوات، فلاح کا حقیقی اور مثالی معیار تاریخ کے صفحات پر ایک لازوال تصویر کی طرح چھوڑا ہے۔ اجتماعیت کی یہ تاریخی مثال قرآنی قانون کا بہترین مظہر تھی۔

قرآن کے تصور قانون کا وہ علم تھا جو ہر عہد میں ہوشمند مسلمانوں کے سامنے رہا اور انکی فکر و نظر کو برابر فَکَّ رَقَبَةٍ : گردنوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرانے کی جدوجہد جاری رکھنے کا سبق دیتا رہا۔ احکامات قرآن کا مقصد اور مقصود یہی فَکَّ رَقَبَةٍ : گردن کو ماسوا کی غلامی سے آزاد کرانا ہے۔

حدیث وسنّت

خلافت راشدہ کے زمانے ہی میں اسلامی تہذیب وریاست کو وسیع قانون سازی کی حاجت پیش آنے لگی تھی۔ مسائل بھی تھے اور تفصیلات کے پیدا کردہ سوالات بھی تھے جن کو حل کرنے اور جنکا جواب تلاش کرنا ضروری تھا۔ بنیادی طور پر یہ ضرورت قران مجید سے پوری کی جاتی تھی جیسا کہ آجتک دستور ہے کہ انفرادی اور اجتماعی معاملات میں قران مجید ہی ملّت اسلامیہ کی، یا اسکے کسی فرد کی رہنمائی کرتا ہے۔

قران وحی متلو ہے اسکے الفاظ بھی الہامی ہیں اور معانی بھی لیکن اسکی مزید تشریح و تفسیر خود رسول اللہ کی زبان سے ہوئی جسکو وحی غیر متلو کہا جاتا ہے یہ وہ وحی ہے جو معانی کے اعتبار سے خدا کی مرضی ومنشا سے رسول اللہ نے ملّت اسلامیہ تک اس وقت تک پہونچائی جب آپ مسلم معاشرے کی تعمیر وتشکیل میں مصروف تھے اسکے الفاظ الہامی نہیں ہیں: حدیث اسی کا نام ہے یہ رسول اللہ کے ان ارشادات کا نام ہے جو قران کی مزید وضاحت کے لئے آپ نے زبان مبارک سے ادا کئے تھے۔

قانون قرآن کو عملاً قائم کرنے میں رسول اللہ نے جو طریقہ کار اپنایا تھا، وہ سنت الرسول کہلاتا ہے۔ اسلام ایک سادگی رکھنے والا اعلیٰ دین ہے قرآن و سنت اسکے پورے دینی ڈھانچے کو مکمل کرتے ہیں، عقاید و اعمال کے لئے ان دونوں مجموعۂ قوانین و احکامات کے بعد کسی چیز کی حاجت نہیں۔

پہلی صدی ہجری میں ہی بڑی سرگرمی سے سنت الرسول کی سمت توجہ کرلی گئی۔ رسول اللہ کے ارشادات جمع کئے جانے لگے تھے اور آپ کے طریقہ کار کو یاد رکھنے، محفوظ کرنے اور سند کے طور پر پیش کرنے کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا۔ شہر مدینہ اس سرمایہ کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ رسول اللہ کی مقدس شخصیت سے عام مسلمانوں کی گرویدگی اور اصحاب الرسول نے جس تفصیل سے سیرت و کردار رسول کا مشاہدہ کیا تھا اسکا منطقی تقاضہ تھا کہ رسول اللہ کے بارے میں معلومات بڑی باریک تفصیلات سمیت جمع کیجاتیں اور انکی اشاعت ہوتی۔ اسلام کی عملی تشریح کے لئے لازمی تھا کہ رسول اللہ کی تعلیمات اور انکی عملی زندگی کو نمونہ بنایا جائے۔ مدینہ میں مسلمانوں نے قرآن کی تعلیم اور رسول اللہ کی تربیت و ارشادات کو فلسفیانہ اور کلامی موشگافیوں کے بغیر جمع کرنے، ترتیب دینے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ مدینہ میں رسول اللہ کی زیارت کرنے والے، آپ کے ارشادات سننے والے اور آپ کی تعلیمات سے براہ راست استفادہ کرنے والے بکثرت لوگ زندہ اور موجود تھے۔ اسلامی تہذیب کی وسعت کے ساتھ اسکے قانون کی وسعت ہورہی تھی اور اسلئے وحی غیر متلو کیطرف توجہ بڑھ گئی۔ رسول اللہ کی سنت اور حدیث چونکہ خدا کی مرضی و منشا کے بغیر وجود پذیر نہیں ہوسکتی تھی اس لئے وحی غیر متلو (سنت اور حدیث) پہلی صدی ہجری میں ضرورت اور عقیدت کا مرکز بن گئی۔

سنت (آبائی وراثت میں ملنے والا طریقہ) عربی زبان کا ایک عام لفظ ہے۔ قدیم عربی سماج میں قانون کی جگہ سنت ہی کو حاصل تھی۔ ہر قبیلہ اپنے باپ دادا کی سنت پر عمل کرتا تھا۔ مذہب و اخلاق بھی اسی باپ دادا کی سنت سے بنتے تھے۔ اور خانہ جنگی، قبائلی دشمنی اور عام گمراہیاں بھی اسی سنت کا نتیجہ تھیں۔ اسلام نے سنت کے عام لفظ کو ایک خاص اصطلاح بنا کے اسکے معانی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے قران مجید میں کہا گیا: "اللہ تعالیٰ کی بھی سنت ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔" اسکے بعد قران مجید نے اہل مکہ کی مذمت کی ہے کہ وہ سنت اللہ کے انکاری ہیں اور باپ دادا کی سنت پر جمے رہنا پسند کرتے ہیں اس طرح اسلام نے سنت کی وہ اصطلاح قائم کی جو معاشرتی اور سماجی قانون اور اجتماعی اخلاقیات کی حد بندیاں اور قرانی نظام زندگی کی تعریف و تشریح کرتی ہے۔ رسول اللہ کی عملی تعلیم اسکا سرچشمہ ہے اس کا اطلاق صرف ان قوانین و تعلیمات پر کیا جاتا ہے جو قران کے نہیں ہیں لیکن قرآن کی تشریح کرتے ہیں۔ کتاب اللہ کی عملی تفسیر کے لئے سنت رسول ضروری بھی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ کا ہر عمل و فعل، حکم و ارشاد یا آپکی زندگی کا کوئی نمونہ و مثال سنت و حدیث کا مرکزی موضوع تسلیم کئے جاتے ہیں۔

○

سنت الرسول کا بیان حدیث میں کیا جاتا ہے اسکی مثال کے لئے یہ نمونہ ملاحظہ کیجئے:

"عقبہ بن عمیر نے کہا: کسی نے رسول اللہ کی خدمت میں ایک ریشمی عبا پیش کی آپ نے اسکو پہنا اور نماز پڑھائی مگر بعد میں اسکو نوچ کے نفرت سے اُتار پھینکا اور کہا کہ: یہ (لباس) خدا سے تقویٰ کرنے والے آدمیوں کیلئے مناسب نہیں۔"

عقبہ بن عمیر ایک صحابی ہیں۔ انھوں نے ایک واقعہ اور رسول اللہ کا ایک ارشاد بیان

کیاہے جس سے آپ کے عمل، فعل اور مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ حدیث کے علم میں اصحاب رسول سے اسی قسم کے ارشادات کو جمع کیا گیا ہے۔

ابتدا میں حدیث جمع کرنے والوں نے کسی خاص احتیاط سے کام نہیں لیا۔ معانی پر زیادہ توجہ رہتی تھی اور الفاظ پر اتنی نگاہ نہ تھی۔ حدیث زبانی روایت سے ایک نسل کو دوسری نسل تک پہونچتی تھی کیونکہ کتابت و کتاب سازی کے ذریعے بہت کم تھے مگر پھر بھی لوگوں نے بہت شروع میں احادیث کے تحریری ذخیرے فراہم کرلئے دو تین نسلوں کے بعد قانون و عقائد سے متعلق بکثرت احادیث سامنے آنے لگیں۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ حدیث کی اس کثرت کی وجہ سے ان میں صحیح اور غلط کا امکان کیا ہے اور احادیث میں امتیاز صحیح و غلط کا کیسے کیا جا سکتا ہے؟

واقعہ یہ تھا کہ فقہ یا عقیدے کے اختلاف پر لوگ اپنی اپنی رائے کی حمایت میں رسول اللہ کا قول پیش کرتے تھے۔ اکثر موقعوں پر لوگوں نے نیک نیتی سے حدیث گڑھ لی تاکہ اپنے عقیدے یا رائے کو جیسے وہ اسلام کا اصلی رویہ خیال کرتے تھے، اس حدیث سے امداد پہونچائی جائے۔ جان بوجھ کے غلط عقاید کی اشاعت کرنے والوں نے بھی احادیث وضع (گڑھنا) کرنا شروع کردی تھیں۔ حدیث کے لئے عام مسلمان آبادی کا رویہ احترام کا تھا انکو سننے اور آنکی اطاعت کا جذبہ عام تھا اور لوگ حدیث کی تلاش میں بڑے بڑے سفر کرکے تکالیف اُٹھاتے تھے کہ کسی طرح سے رسول اللہ کے کسی قول یا فعل یا حکم سے واقف ہوں۔ ان باتوں نے موضوع (گڑھی ہوئی) حدیثوں کا بازار گرم کردیا۔ چنانچہ سابقہ قصّوں، یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں اور انکے قانون و اخلاق سے، یہانتک کہ یونانی فلسفے تک سے استفادہ کرکے ایک بڑا ذخیرہ موضوع

احادیث کا تیار کر لیا گیا۔

علم حدیث کے عالموں اور ماہروں نے اس فتنے کی روک تھام اور بندش کے لئے اصول و طریقے بنائے اب علم حدیث نے ارتقا کے راستے پر قدم رکھا اور اس کے اصول و احکام طے ہونے سے اس میں بڑی بلندی پیدا ہوئی جسکو محدثین (حدیث کے ماہر علما) نے چار چاند لگا دئے۔ موضوع حدیثوں کو الگ کرنے کے لئے محدثین نے سلسلہ سند کا اصول قائم کیا یعنی: ہر حدیث کے بیان کرنے والے سے آخری آدمی تک: خود وہ صحابی جس نے رسول اللہ کے وقت میں اس حدیث کو سنا تھا، ہر فرد کے حالات اور مزاج کی جستجو کی جانے لگی۔ جس حدیث کو کئی اسناد حاصل ہوں یعنی جس کو کئی اصحاب نے بیان کیا ہے اور ان سے سن کے کئی آدمیوں نے الفاظ یا معانی کے خفیف سے فرق سے بیان کیا ہے اسکو محدثین حدیث صحیح مانتے ہیں۔ مثلاً جو حدیث صفحہ ۱۷ پر بیان کی گئی ہے یہ صحیح بخاری میں ان اسناد سے ہے: ہم سے عبداللہ بن یوسف نے کہا کہ مجھ سے لیث نے کہا تھا کہ یزید کہتے تھے کہ ابوالخیر نے بتایا کہ رسول اللہ کے صحابی عقبہ بن عمیر نے کہا تھا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ کے سامنے . . . . الخ۔

○

یہ دوسری اور تیسری صدی ہجری کی بات ہے کہ حدیث کے ارتقا نے سلسلہ اسناد کے علاوہ ایک نئے ضمنی علم کو جنم دیا۔ یہ رجال کا علم تھا اور حدیث کی چھان بین نے پیدا کیا تھا۔ رجال کے علم کے ذریعے حدیث کی روایت کرنے والوں میں سے ان افراد پر تبصرہ اور انکے کردار کا جائزہ لیا جاتا ہے جو حدیث کو رسول اللہ کے کسی صحابی سے روایت کرتے ہوں تاکہ ان کے ذاتی سیرت و کردار سے اندازہ لگایا جا سکے کہ انھوں نے کہیں جھوٹ

تو نہیں بولا؟ رجال میں راویوں کی زندگی، سیرت و اخلاق، معاصروں سے انکے تعلقات اور انکے ذاتی عقاید کا جائزہ ہوتا ہے۔ ہر سند کے راوی کا یہ تنقیدی جائزہ اسکی روایت کے مقصد کو متعین کرنے میں کامیاب ہوتا ہے کہ کہیں وہ بے اعتبار، غلط عقاید کا شکار اپنے معاصروں کا حریف اور دروغ گو تو نہیں تھا؟ کیونکہ اگر وہ ایسا تھا تو پھر اسکی بیان کردہ حدیث موضوع (گڑھی ہوئی) ہوسکتی ہے۔

راویان حدیث کی تاریخ و سوانح یعنی رجال کے فن میں بہت بڑی تصنیف طبقات ابن سعد ہے جسکو امام ابن سعد (وفات ۲۳۰ھ/۸۴۵ء) نے راویان حدیث کے حالات میں لکھا ہے۔ اس مفصل کتاب کی آٹھ جلدوں میں ہزارہا راویوں کے ذاتی حالات ہیں اور ان کے قابل وثوق یا دروغ گو ہونے کے امکان کی طرف اشارے ہیں رجال کے فن کی ترقی جاری رہی اور طبقات ابن سعد جیسی کتابیں برابر تصنیف کی جاتی رہیں جن میں نہ صرف راویان حدیث بلکہ فقہ و تفسیر، حدیث و رجال کے ماہروں اور علمار کے ذاتی حالات و سوانح جمع کئے گئے ہیں۔

○

ایسے سوانحی مواد کی موجودگی میں کسی حدیث کو پرکھنا زیادہ مشکل نہیں۔ راویاں حدیث کے ان حالات میں انکے اخلاقی کردار، صداقت شعاری اور قوت حافظہ کا بطور خاص ذکر ہے۔ یوں بھی ذاتی فکر و نظر کی بنا پر محدثین نے باہمی اختلاف کیا ہے اور اکثر موقعوں پر انکی سخت تنقید و جرح سے وہ حدیثیں بھی نہیں بچ سکی ہیں، جنکو عام طور پر شہرت حاصل تھی۔ اپنی ان تحقیقوں، اصول پرستیوں اور گہری علمی تحقیقات کے ذریعے عالمان حدیث نے اپنے علم کو ایک باوقار اور مستحکم علمی سرمایہ بنا دیا۔ آخر انھوں نے حدیث کو تین اقسام میں

تقسیم کرکے انکی عام درجہ بندی کی: صحیح (درست) حسن (اچھی) ضعیف (کمزور) ایک صحیح حدیث وہ ہے جو راویان حدیث نے براہ راست ایک دوسرے سے سنی ہو اور سب کے سب قابل اعتماد ہوں، ایک حسن ایسی حدیث ہے جس کے سلسلہ سند میں ایک راوی کمزور ہو لیکن اسکی تصدیق دوسری احادیث سے ہوتی ہو۔ ضعیف احادیث وہ ہیں جن کے اسناد میں راوی معتبر نہوں۔ یہ حدیث کی عام درجہ بندی ہے اسکے علاوہ علمائے سلف نے اس میں بہت سی نزاکتیں کی ہیں اور مختلف درجہ بندیوں کے اعتبار سے احادیث کے بہت سے مجموعے تیار کئے جا چکے ہیں۔

احادیث کے ابتدائی مجموعے حدیث کے علم کے نقطۂ نظر سے نہیں، لیکن قانونی مقاصد سے تیار کئے گئے تھے اُسکی بہترین مثال امام حنبل (وفات ۸۵۵ء) کا مجموعہ ہے جس میں تیکس ہزار کے قریب احادیث شامل ہیں۔ اب بھی احادیث کے مجموعے جن ابواب میں تقسیم ہوتے ہیں وہ مسائل و احکام کے مختلف عنوانات رکھتے ہیں تیسری صدی ہجری میں حدیث کے علم کو بڑی ترقی ہوئی اور یہ وہ باقاعدہ سائنس (علم) بن گیا جو آج بھی ہے اسی صدی میں حدیث کے وہ عظیم الشان اور والا مرتبت ذخیرے تیار ہوئے جنھوں نے کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح کتاب کا درجہ اختیار کیا: امام بخاری (وفات ۸۷۰ء) اور امام مسلم (وفات ۸۷۵ء) کے دونوں ذخیرے اپنی وسعت، ہمہ گیری اور علمی احتیاط و تحقیق کے ایسے شہ کار ہیں کہ انکو فوراً عالم اسلام میں حدیث کے مجموعوں کا حرف آخر تسلیم کر لیا گیا اور اپنے اگلے پچھلوں پر انکو وہ فوقیت حاصل ہوگئی جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

امام بخاری کی کتاب، جسکو خدا کی کتاب کے بعد شریعت و فقہ کے استفادے میں سب سے زیادہ بہتر تسلیم کیا جاتا ہے، ایک ضخیم کتاب ہے۔ یہ ۹۷ حصوں میں بانٹی گئی ہے اور اسکے تین ہزار چار سو پچاس باب ہیں۔ ہر حصے کو عقاید و فقہ کے کسی مرحلے سے متعلق قائم کیا گیا ہے مثلاً: صلوٰۃ، صوم، خیرات، شہادت، خرید و فروخت، ضمانت نکاح۔ ہر باب میں کئی کئی چھوٹی بڑی احادیث جمع کی گئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان معاملات و مسائل میں رسول اللہ نے کیا حکم دیا؟ کس چیز سے روکا؟ یا آپ کے زمانے میں ان مسائل میں مسلمانوں کا کیا طرز عمل تھا جس کو آپ نے پسند یا ناپسند فرمایا اس مجموعے میں آیات قرآن نقل کر کے احکامات شریعت کی وضاحت میں احادیث مرتب کی گئی ہیں۔ امام بخاری نے اپنی کتاب کا مقصد یہ مقرر کیا تھا کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے ایک ایسا قانونی ہدایت نامہ تیار کر دیا جائے جو کتاب اللہ اور سنت رسول دونوں کو سامنے لے آئے اس مقصد میں وہ کامیاب رہے انھوں نے باریک بینی اور غور و فکر کے بعد صحیح ترین احادیث جمع کیں۔ بخاری کی سات ہزار تین سو سے زیادہ احادیث میں اکثر احادیث کو مختلف موقعوں پر منطبق کر کے دوہرا دیا گیا ہے اور انکی اصل تعداد دو ہزار چھ سو بہتر قرار پاتی ہے۔ امام بخاری کا کارنامہ صرف یہی نہیں کہ انھوں نے احادیث کا ایک ایسا جامع ذخیرہ تیار کر دیا جس میں ہر موضوع کے متعلق صحیح احادیث ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے احادیث کی جمع اور ترتیب میں بڑی باریک بینی اور علمی بصیرت سے کام لیا۔ ہر نوعیت کی قابل وثوق احادیث اپنے مجموعے میں شامل کی ہیں اور انکو اپنے زمانے کی دو لاکھ احادیث سے انتخاب کیا ہے بقیہ کو انکی علمی کسوٹی نے پرکھ کے مسترد کر دیا تھا۔

علمی اور تحقیقی دنیا میں امام بخاری کا کارنامہ بڑی عزت سے دیکھا جاتا ہے انہوں نے اپنی محنت سے ایسا کام انجام دے چھوڑا جو ہر زمانے میں انکی پاک بازی اور بے نفسی کا اعتراف کرتا رہا ہے۔ بخاری میں حدیثوں کے باہمی اختلافی بیان (چاہے الفاظ میں ہوں یا معانی میں) بغور مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔ سلسلہ سند یا متن میں شبہ پیدا کرنے والی باتوں کو ظاہر کر دیا گیا ہے اگر کسی حدیث کے راوی نے اپنے سابقہ راوی سے خود یہ حدیث سماعت نہیں کی بلکہ کسی کے توسط سے سنا تو بھی اسکا ذکر موجود ہے۔ غرض بخاری میں حدیثوں کی جمع و ترتیب اور تحقیق و تدوین امام بخاری کی علمی بلندیوں گہری نظر اور صاف گوا ایمانداری کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ انکی کتاب کی مقبولیت کا بڑا سبب یہی ہے کہ یہ نہ صرف عملی ضروریات کو پورا کرنے والی حدیثوں کا مجموعہ ہے بلکہ علم حدیث، رجال، تنقید حدیث اور بصیرت کا بھی شاہ کار ہے۔

امام بخاری کی طرح امام مسلم (وفات ۸۷۵ء) کا مجموعہ احادیث بھی ایک جامع کتاب ہے۔ یہ دونوں کتابیں "صحیحین" کہلاتی ہیں۔ اسلامی قانون کو تہذیبی ارتقا کے تیز عمل نے مزید ہمہ گیری کی دعوت دی تو سنت الرسول سے استفادے کی خاطر احادیث کے مزید مجموعے مرتب ہوئے۔ ان میں نمایاں درجہ امام ابو داؤد (وفات ۸۸۹ء)، امام ابو عیسی محمد ترمذی، (وفات ۸۹۲ء) امام نسائی (وفات ۹۱۵ء) اور امام ابن ماجہ (وفات ۸۹۶ء) کی کتابوں کا ہے۔ ایک قلیل عرصے میں ان چھ کتابوں نے جن کو انکی علمی تحقیق اور بلندی کی وجہ سے "صحاح ستہ" کہا جاتا ہے۔ مسلم معاشرے کے لئے قانون کی بہترین تعبیر و تشریح کا مواد فراہم کر دیا۔

احادیث کے مجموعے برابر مرتب ہوتے رہے۔ ان نئے مجموعوں میں ترتیب و مواد کے

اعتبار سے نئی نئی باتیں نظر آتی ہیں، احادیث کو مختلف موضوعات اور مسائل کے لحاظ
سے جمع کیا گیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ احتیاط اور ژرف نگاہی سے کام کم لیا گیا اور
اکثر موقعوں پر قانونی ضروریات یا اخلاق و عقاید کے پیچیدہ سوالات کے حل کے لئے کمزور
احادیث کو بھی قبول کر لیا گیا۔

حدیث و فقہ کے ماہروں نے آخر یہ فیصلہ کیا کہ امام مالک بن انس کی موطا
اور اسکے بعد یہ چھ کتابیں بلا پس و پیش صحیح حدیثوں کے مجموعے کی حیثیت سے قبول
کی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ ان میں وہ علمی احتیاط، تحقیق اور باریک بینی برتی گئی ہے جو صحیح
حدیثوں کو غلط حدیثوں سے الگ کر کے منتخب کر سکتی ہے۔ چنانچہ اب تک یہی کتابیں
حدیث کے مستند ترین مجموعوں کی حیثیت سے عالم اسلامی میں رائج ہیں۔

○

زمانہ جدید میں روشن خیال طبقہ نے ذخیرہ حدیث کو بطور حجت تسلیم کرنے سے انکار
کیا ہے۔ انکی دلیل یہ ہے کہ حدیث میں بہت سی ایسی روایات داخل ہیں جو اصل
اسلام میں نہیں ہیں اور حدیث کی وجہ سے عقاید و عمل میں غیر ضروری پیچیدگی پیدا ہو گئی
ہے۔ اس طبقہ نے زیادہ تر سلسلہ اسناد کو قابل وثوق تسلیم کرنے سے انکار کر کے حدیث
کو مشتبہ سمجھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص کسی موضوع حدیث کو گڑھنے کے بعد سلسلہ
اسناد کے نام بھی گڑھ سکتا ہے۔ لیکن یہ اعتراض ایک بہت بڑی حقیقت کو نظر انداز کرتا
ہے وہ یہ کہ موضوع حدیث اور موضوع سلسلہ اسناد کو محدثین کی تصدیق کے بغیر درست
نہیں مانا جا سکتا اور عام طور پر محدثین کا تنقیدی علم اتنا وسیع اور انکی طبع پاک نہاد اتنی
بلند تھی کہ وہ غلط اور صحیح میں بآسانی امتیاز کر لیتے تھے۔ سلسلہ اسناد پر دوسرا اعتراض

یہ ہے کہ اس کا رواج دوسری صدی ہجری میں ہوا۔ مثلاً مشہور صوفی اور خدا رسیدہ بزرگ خواجہ حسن بصری اپنے وعظ میں جو احادیث بیان کرتے تھے ان میں وہ راویوں کا نام نہیں لیتے تھے۔ سلسلہ اسناد کا رواج اس وقت سے ہوا ہے جب کہ احادیث میں موضوعہ روایتوں کی کثرت ہوئی۔ لوگ شبہ کرنے لگے اور حدیث کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے بیان کرنے والوں نے راویوں کے نام لینے شروع کئے تاکہ وہ اپنی بیان کردہ حدیث کو درست قرار دے سکیں۔ سلسلہ سند کا بطور دلیل کے رائج ہونا ہی اسکی کمزوری کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

علم حدیث کے ماہر اس بات کو نظر انداز نہیں کرتے۔ انھوں نے روایت کے علاوہ درایت کا اصول بھی تسلیم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی حدیث بظاہر سلسلہ اسناد درست رکھتی ہے مگر اپنے مفہوم کے اعتبار سے شریعت کے مزاج عمومی سے علٰحدہ ہے تو اسکو وثوق کے درجے میں نہیں رکھا جائے گا۔ ایک مشہور حدیث ہے:
"رسول اللہ نے فرمایا کہ میرے بعد مجھ سے منسوب باتوں کی کثرت ہوگی۔ مجھ سے منسوب کرکے تم سے جو کچھ بھی کہا جائے، اسکو کتاب اللہ سے ملا کے دیکھو، تاکہ معلوم ہو کہ یہ غلط ہے یا صحیح؟"

یہ حدیث خود درایت کے اس اصول کو قائم کرتی ہے جسکی موجودگی میں پیچیدہ عقائد، اسرائیلی روایات اور فلسفے کے جوڑ توڑ سے متعلقہ موضوع احادیث کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ اسکے علاوہ محدثین نے درجہ بندی کے وقت ایک اور بات کی احتیاط کی ہے وہ یہ کہ: اگر حدیث محض اخلاق و معاشرت کے بارے میں کوئی حکم ہو تو وہ نرمی سے کام لیتے ہیں لیکن عبادات، عقاید، فقہ اور تفسیر و شریعت کے مسائل کے سلسلے میں جو

احادیث ہیں انکو بڑی سختی سے جانچا پرکھا جاتا ہے۔ محدثین نے صرف سلسلہ اسناد کے سہارے کبھی آرام نہیں کیا۔ امام بخاری جیسے بلند پایہ محدث نے اعتراف کیا کہ انکو روایت کردہ احادیث میں بعض کی صداقت مشتبہ باقی رہ گئی اور وہ تحقیق و تمدین کے پورے مرحلے سے نہیں گزر سکی ہیں۔ علم حدیث اور محدثین نے سنت الرسول کے سلسلے میں، دو بنیادی کام کردئے ہیں اور یہی اُن کے عظیم الشان علمی کارنامے کی بنیاد ہیں ایک تو یہ کہ انھوں نے عقاید و اعمال کے لئے کتاب اللہ کے بعد سنت الرسول کا ایک ایسا ممکنہ حد تک صحیح ذخیرہ فراہم کردیا جو دوسری صدی ہجری میں پوری طرح تیار تھا۔ اور شائع ہوچکا تھا، جبکہ تابعین اور تبع تابعین کی نسل موجود تھی، جنھوں نے اسلام کو رسول اللہ کے تربیت یافتہ اصحاب کے زیر تحت تعلیم و تربیت پاکے سمجھا تھا۔ دوسرا کام یہ ہے کہ محدثین نے اپنی محنت، ذہانت اور علمیت سے ایسی کسوٹی تیار کردی کہ آگے چلکر حدیث کے ذخیرے میں غلط باتوں کا اضافہ ناممکن ہوگیا اور جو حدثیں سامنے تھیں ان میں سے صحیح یا غلط کو چھانٹنا ممکن ہوگیا۔ یہ دو کام علم حدیث و محدثین کو اسلامی تہذیب میں ایک ایسی جگہ دیتے ہیں جس کو ان سے کوئی چھین نہیں سکتا۔

ہاں جہاں تک تیسری صدی ہجری کے بعد کے زمانوں کا تعلق ہے، یہ ایک تعجب انگیز المیہ ہے کہ جیسے جیسے حدیث کی جانچ پڑتال کے علوم میں اضافہ ہوا ہے محدثوں اور عالموں نے اپنے آپ کو کم سے کم علمی مرتبے پر قانع رکھا اور حدثیوں کے انتخاب انکے قبول اور بیان میں بڑی سستی کرنے لگے۔ تصوف اور فلسفے کی مارنے اور تباہی مچادی اور آخر زمانے میں تو صوفیوں نے حدیث کے سارے علم سے منہ پھیر کے موضوع احادیث کو بڑی کثرت سے بیان کرڈالا۔ انکو سلسلہ سند پر کبھی نہیں جانچا،

درایت سے کام لئے بغیر حدیثوں کے اس استعمال پر ذمہ داری بہرحال علم حدیث اور محدیث کے سر پر نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے علم سے فائدہ اُٹھانے میں دوسروں نے غفلت کی۔

○

تاریخ اعتبار سے احادیث موضوعہ بھی ایک دلچسپ اور مفید مواد ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلامی تہذیب کو کن کن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا ہے اور اسلام کی قوت اصلی سے غیر اسلامی عناصر نے کس طرح معرکے گرم کئے ہیں مثلاً ان موضوع احادیث کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بنو امیہ کے اقتدار کے خلاف کیا کیا مذہبی دلائل تراشے گئے؟ شیعہ فرقہ کا کیسے قیام ہوا اور یہ کتنی شاخوں میں بٹ گیا؟ عباسی گھرانے اپنی سلطنت کے قیام کے لئے کس طرح وراثت کے اس اُصول کو رائج کیا کہ مسلمانوں کا خلیفہ بھی رسول کے خاندان سے ہونا چاہئے؟ موضوع احادیث میں فقہ و عقاید کے ان اختلافات کی بھی جھلکیاں ملتی ہیں بعد میں یونانی فلسفے اور منطق اور یہودی و عیسائی اثرات نے پیدا کئے اور یہی موضوع احادیث ہیں جن کو گمراہ صوفیوں نے اپنی رہبانیت زندگی سے فرار اور شریعت شکنی کے لئے گڑھا اور رائج کیا ہے۔

درایت و تحقیق کے دروازے کھلے ہیں رجال و اسناد کی جانچ پرکھ کے لئے علمائے متقدین نے اتنا مواد فراہم کردیا ہے کہ احادیث موضوعہ کو پہچان کے مقام اعتبار سے ہٹا دینا کچھ بھی مشکل نہیں رہ گیا۔ مشکل یہ ہے کہ تخلیقی جدوجہد کے فقدان نے اجتہاد کا خاتمہ کردیا ہے اور فکر و نظر پہ پہرے لگادئے ہیں۔ جب بھی وقت مناسب ہوگا۔

اس کام کا آغاز ہو جائے گا۔ یہ زمانہ کی ضرورت کا تقاضہ بھی ہے اور خود علم حدیث کی تاریخ کا بھی کہ ذہن تاریک نہ ہوں، عقاید بگڑیں نہیں بلکہ کتاب اللہ کو سمجھنے کے لئے حدیثوں کے ذخیرے کی صحیح احادیث سے استفادہ کیا جائے۔

ہندوستان میں علم حدیث کو پھیلانے کا کام مجدد الف ثانی کے ہمعصر شاہ عبد الحق محدث دہلوی (وفات ۱۶۴۲ء) نے انجام دیا اور فارسی میں جو ہندستانی مسلمانوں کی عام زبان بن چکی تھی، علم حدیث کے متعلق تصنیف و تالیف کا آغاز کیا اور حدیثوں کے ترجمے کئے۔ شاہ صاحب کے صاحبزادے مولانا نور الحق (وفات ۱۶۶۳ء) عہد شاہ جہانی میں شیخ الاسلام تھے۔ بخاری و مسلم کی شرح لکھی انکے اثر سے مغل نظام عدلیہ میں بھی فقہ کے پہلو بہ پہلو عمل بالحدیث کا زور بڑھا۔ ولی اللہ اللہی خانوادے کی تحریک سے عمل بالحدیث کا رجحان مزید بڑھا۔ یہانتک کہ سلفی تحریک نے علمار کے ایک بڑے حصّے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ عقاید و قانون کے شعبے میں قیاس کے مسترد کرنے اور خالص اسلام کے دور اوّلیں کی طرف لوٹنے کی پر زور دعوت دیتی تھی۔ معاشرے کی اصلاح کے علاوہ اس نے بنگال میں فرائضی تحریک کی شکل اختیار کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی سے باقاعدہ مسلّح ٹکّری اور صوبہ سرحد کے آزاد علاقوں میں مخالف سامراج مہم میں بڑا اہم حصّہ لیا۔

قانون کا ارتقا

اسلام کی تاریخ میں شریعت کا ارتقا قانون کے دائرے میں بہت تیز ہوا ہے یہ اسلامی تہذیب کی عمل پسندگی اور سادگی کا تقاضہ تھا بھی کہ اسکا قانون جلد از جلد بنے، مستحکم ہو اور وسیع ہو جائے۔ چنانچہ اسلام کی شریعت میں قانون کا ڈھانچہ پہلے تیار ہوا اور اسکا ارتقا تیز رہا۔ اسکے مقابلے میں عقاید کی حد تک شریعت پر توجہ بعد میں ہوئی جب یونانی اور غیر اسلامی اثرات نے عقاید میں تغیرات پیدا کرنے شروع کئے تو شریعت کا وہ ذخیرہ تیار ہوا جس میں عقاید کا تفصیلی بیان ہے لیکن شریعت کے اس حصے پر وہ حصہ اپنی اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے برابر غالب رہا ہے جس کا تعلق انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی معاملات کے لئے قانون بنانے سے ہے۔ شریعت اسلام میں فقہ و دینیات دونوں شامل ضرور ہیں لیکن غالب حصہ فقہ کا ہے۔

قانون کا مرتبہ اسلامی تہذیب میں ایک علیحدہ اور انفرادی علم کا نہیں ہے، بلکہ اس نے کتاب و سنت کے عملی پہلوؤں سے اپنا ڈھانچہ بنا لیا ہے۔ شروع ہی سے مسلمانوں

کے نزدیک قانون اور دینی زندگی الگ الگ نہ تھیں۔ قرآن میں دونوں پہلو ساتھ ساتھ بلکہ ملے ہوئے ہیں اور یہی حال حدیث کا ہے۔ قرآن اور حدیث کے احکام کے مطالعہ اور تشریح کیلئے دونوں پہلو بیک وقت نظر کے سامنے رکھے گئے۔ دوسری صدی ہجری میں ایک خط امتیاز کھینچا گیا جس نے علم شریعت (عقاید و الہیات) اور فقہ (انفرادی واجتماعی قانون) کو الگ الگ کیا۔ اس کے بہت بعد یونانی لفظ کینن (CANON) کو مسلم اقتدار کے ضابطوں، مقامی ضابطوں اور اس عام قانون کے لئے استعمال کیا جانے لگا جس کا تعلق زیادہ تر انتظامی معاملات سے ہے۔

اسلامی قانون کا آغاز فرائض دینی کی تشریح سے ہوا تھا۔ اسلام کے پانچ ارکان روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج اور جہاد کی تشریح اور ان کے لئے جزوی قانون بنانے سے فقہ کے بڑے ذخیرے کی بنیاد پڑی۔ اسلامی قانون یا فقہ ایک ایسی چیز نہیں ہے جو سماج کے بدلتے ہوئے حالات کے مطالعے سے انسانی ذہن پیدا کرے۔ بلکہ یہ ایک ایسا قانون ہے جس کی بنیادیں کتاب اللہ اور سنت الرسول نے طے کردی ہیں۔ قانون سازی میں انسانی ذہن کیلئے جو گنجائش ہے وہ تفصیلات میں ہے۔ اس تحدید کے باوجود دوسری صدی ہجری میں فقہ اور قانون کے ماہروں نے جو وسیع ذخیرۂ قوانین مرتب کیا وہ منطقی تناسب اور ظاہری و باطنی تکمیل کا ایسا کارنامہ ہے جو انسانی عقل کیلئے آج بھی حیرت انگیز ہے۔ اس قانون کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ایک مرتبہ فقہ کے ماہروں کی ان کوششوں پر نگاہ ڈال لی جائے جو انھوں نے مواد کی ترتیب کی خاطر کیں اور اس طرح اسلامی قانون اور قانون سازی کا ارتقار شروع ہوا۔

قران و حدیث اسلامی قانون کی بنیاد بھی ہیں اور اس کا راستہ طے کرنے والے بھی،
اب اُس ذہن کا جائزہ لینا چاہئے جس نے قرآن و حدیث سے استخراج قانون کیا ہے
پہلا سوال یہ ہے کہ قرآن و حدیث کو اسلامی قانون کی بنیاد کیوں مانا جاتا ہے؟ جواب
یہ ہے کہ اسلام نے انسانی عقل اور ارادہ کو ایک خاص سمت میں سفر کرنے سے روکا ہے
اور ایک خاص سمت میں اُس کا رُخ موڑ دیا ہے۔ مابعد الطبیعاتی کی زبان میں یوں کہنا
چاہیئے کہ اس کے نزدیک انسانی ذہن، وجود خداوندی، مقاصد کائنات اور حقیقت
مطلق کا درست اور صحیح ادراک نہیں کر سکتا۔ انسانی ذہن کے لئے سرگرمیوں کا میدان
اسلام نے اس طرح بنایا ہے کہ ایمان اس کا آسمان اور توحید اس کی زمین ہے۔ انسانی
ذہن کو ایمان کے ذریعہ حقائق کا بنیادی علم خدا کے رسولوں کے واسطے سے ملتا ہے اور
ان کی پوری زندگی توحید پر جمے رہنے سے مکمل ہوتی ہے۔ توحید کا مقصد یہ ہے کہ آدمی
خدا کی پوری اطاعت کرے۔ اس اطاعت کا ضابطہ ہر زمانے میں اللہ کے رسولوں
نے خیر و شر کے معیار انسانوں کے سامنے رکھ کے بنایا۔ آدم علیہ السلام کے وقت سے لیکر
آخری رسول کے مبارک زمانے تک خیر و شر کے معیار اور زندگی کے ضوابط انسان کو اس
کی درجہ بدرجہ ترقی کے اعتبار سے ملتے رہے۔ ہر ایک رسول نے انسان کے لئے قانون
الہٰی کو کچھ بڑھا کے کچھ پھیلا کے دونوں صورتوں میں سابقہ قانون الہٰی میں نمایاں ترمیم
کر کے پیش کیا۔ قرآن وہ آخری قانون الہٰی ہے جو انسان کے لئے آخری، مکمل اور ہر اعتبار
سے کامل ضابطۂ حیات ہے۔ قرآن کے احکامات اور اس کی ضابطے بندی کی بہترین
تشریح خود رسول اللہ ہی سے ممکن تھی کیونکہ وہ نہ صرف وحیٔ الہٰی اور حکم خداوندی سے
قوانین اسلام کو قائم کرتے تھے بلکہ ان کو قانون الہٰی کے مقاصد کا بھی علم تھا۔ وہ کتاب

اللہ سے سب سے زیادہ واقف تھے اور اس حکمت الٰہی کے مالک تھے جو کتاب اللہ کو عملاً قائم و نافذ کر سکی۔ رسول کے قول و فعل سے نہ صرف کتاب اللہ کی تفسیر ہوئی ہے بلکہ تکمیل بھی وہ اپنے تمام قول و فعل میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی سے فیضیاب تھے اسلئے حدیث قران کے بعد قانون الٰہی کا درجہ رکھتی ہے۔

○

اس مابعدالطبیعاتی اصول کو بنیاد بنانے کے بعد اسلامی تہذیب میں قانون سازی کا مرحلہ آیا تو علم الاصول کی بنیاد پڑی۔ قران و حدیث سے جو امر و نواہی (کرنے نہ کرنے کے حکم) براہ راست ثابت ہوتے ہیں انکو تفسیر و تفصیل کی زیادہ حاجت نہیں لیکن پھر بھی یہ سوال تو ہوتا ہے کہ یہ حکم خاص ہے یا عام، عارضی تھا یا مستقل، برقرار رکھا گیا یا منسوخ ہوگیا؟ کیونکہ قران و حدیث نے ایک زندہ معاشرے اور تہذیب کی تعمیر کی تھی جس میں احکامات درجہ بدرجہ نافذ کئے گئے تھے۔ علم اصول نے یہ طے کیا کہ اگر حدیث و قران کے متن میں کوئی تحدید یا وقتی ضرورت نہ ہو تو تمام احکامات قطعی اور مستقل ہیں۔ اس کے بعد متن کی عربی نثر کے صحیح معنی لسانیات اور لغات سے طے کئے جاتے ہیں۔ علم اصول نے یہ بھی شرط رکھی ہے کہ قران و حدیث کے متن سے ہمیشہ زیادہ سے زیادہ عام فہم اور روز مرہ بول چال کے معنی مراد لئے جائیں گے۔ البتہ جہاں خصوصیت سے استعارہ یا کنایہ ہو وہاں معانی کو لسانیات، محاورے، خطابت، منطق، اور ادب کے معیار پر قیاس سے سمجھا جائے گا۔ اس طرح علم اصول میں قیاس کا سلسلہ شروع ہوا۔ قران و حدیث کی پابندیوں کے ساتھ ساتھ قیاس کے عمل سے فقہ نے ہمیشہ قوت حاصل کی اور تیزی سے ترقی کی۔ جب بھی تمدن بدلا نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں یا نئے مسائل اور حالات کا سامنا ہوا تو قیاس نے

قانون الٰہی کو انسانی ضرورتوں کے سامنے ٹوٹ جانے سے بچایا، شریعت کی رگوں میں تازہ لہو بھرا اور انفرادی و اجتماعی زندگی پر اسلام کی گرفت قائم رکھی۔

فقہ اسلامی کے ارتقا میں قیاس نے جتنی آسانی پیدا کی اس سے ایک خطرہ بھی تھا وہ یہ کہ کہیں بے قید قیاس کا استعمال قانون و اصول قانون میں انتشار نہ پیدا کردے۔ چنانچہ اس خطرے کا ازالہ اجماع کے اصول نے کیا۔ اس کی حیثیت اسلامی فقہ میں قیاس اور اجتہاد کو گمراہ ہونے سے بچانے کے واحد ذریعہ کی رہی ہے۔ اجماع کے معنی قانون دانوں یا عوام میں اتفاق رائے پیدا ہونے کے ہیں۔ اجماع کا اصول قانون سازی کو فرد پسندی اور مرکز گریزی سے بچاتا ہے۔ دوسری طرف یہ ملّت اسلامیہ کے اجتماعی ضمیر کی آواز کو غالب کرتا ہے۔ اسکی وجہ سے شریعت میں انارکی (ANARCHY) نہیں پھیلنے پاتی۔ دوسری صدی اور تیسری صدی ہجری میں فقہ و شریعت کے ماہروں نے اصول اجماع پر بڑا زور دیا تھا، آگے چلکر بھی جب کبھی غیر اسلامی اثرات نے ذہنی انتشار کو جنم دیا۔ گمراہ فرقے پیدا ہوئے اور قیاس کی بے قید پرواز نے غلط عقیدوں کو یا قانون کی خود غرضانہ تعبیر کو رائج کرنا چاہا تو اجماع کی کسوٹی پر کھوٹے کو کھرے سے الگ کردیا گیا۔ یہ تو درست ہے کہ اسلام میں پادریوں اور پجاریوں کا کوئی طبقہ نہ تو خدا اور بندے کے درمیان حائل ہے اور نہ شریعت کسی طبقہ کی میراث ہے۔ لیکن شریعت کے مختلف شعبے ایک باقاعدہ علم بن چکے ہیں اور ان سے کافی واقفیت کے لئے خصوصی نصاب تعلیم و تربیت ضروری ہو چکی تھی اس طرح اسلامی تہذیب میں علماء کا طبقہ پیدا ہوا جس کی حیثیت یہودی معاشرے کے کاتبوں کی طرح تھی جو مذہبی قانون کی تعلیم اس کی شرح اور اس کی اشاعت میں منہمک رہتے تھے۔ اسلامی تہذیب میں قرآن و حدیث کو سرچشمہ

قانون کا مرتبہ تو حاصل تھا ہی یہ ظاہر کہ ان کی تعلیم و تفسیر کے لئے عربی لسانیات، تاریخ اسلام اور علم اصولِ احکام جیسے وسیع اور پیچیدہ علوم سے واقف افراد کی ضرورت تھی چنانچہ عالموں کے طبقہ کا پیدا ہونا ایک فطری واقعہ ہے۔ البتہ ان کے سماجی اور مذہبی اقتدار میں مضبوطی اور گہرائی، اجماع و قیاس کے توازن نے پیدا کی۔ کیونکہ علمار کے طبقہ نے ایک طرف تو بے قید قیاس کے مُضر اثرات کو سمجھ کر اس کی شدید مزاحمت کی دوسری طرف انھوں نے اپنی محنت، ذہانت اور قوت کو ایسی قانون سازی میں لگایا جو ضروریات زمانہ کو پورا کرنے والے قانون بناتی تھی لیکن ملّت اسلامیہ کے اجتماعی ضمیر سے ٹکراتی نہ تھی۔

قانون اسلام میں علمار نے اجماع کو بہت بڑا درجہ دیا۔ یہ اجماع ہی ہے جو قران و حدیث کے متن کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ اجماع ہی ہے جو ان کے متن کے الفاظ کا تلفظ، ان کے معانی کے انطباق کا فیصلہ کرتا ہے۔ عقائد، فقہ اور قانونِ عامہ ہر شعبہ میں اجماع ہی آخری کسوٹی ہے۔ گو یہ کسی ایسی بات کو منسوخ نہیں کر سکتا جو قران و حدیث میں براہ راست حکم کی حیثیت سے موجود ہوں۔ لیکن یہ ان پر عمل کو وقتی طور سے معطل کر سکتا ہے۔ اجماع کی اسی قوت نے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں قران و حدیث کی جو بنیادی تعبیر کر دی تھی وہ آج تک ویسے ہی چلی آ رہی ہے۔ انفرادی طور سے اجتہاد کا حق تسلیم تو کیا جاتا ہے لیکن علمائے اسلام کا عام خیال یہ ہے کہ قیاس و اجتہاد صرف انھیں معاملات میں ہے جن میں اجماع نہیں ہے۔ وہ ان قدیم کتابوں کی تشریح و تعبیر کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں جو اسلام کی پہلی تین صدیوں تک مرتب ہوئیں۔ انفرادی طور سے علمار نے اجتہاد و قیاس کو زیادہ سے زیادہ محدود کر دیا ہے۔

شریعت کے دائرے میں جو قانون سازی ہوئی ہے اس کا پہلا مقصد قرآن و حدیث کی تعلیم کے مطابق منشار خداوندی کے مطابق زندگی کو ڈھالنا اور انفرادی و اجتماعی مسائل کو منشار الٰہی کے مطابق حل کرنا تھا۔ اس طرح یہ طے ہوگیا کہ قانون اسلام سے روگردانی کرنا یا اسے چھوڑنا صرف معاشرے کا جرم نہیں ہے بلکہ ایک مذہبی نافرمانی، گناہ اور دنیا و آخرت دونوں جہاں مستوجب سزا، قدم ہے۔ فقہ اسلام نے یہ تسلیم کیا کہ قانون کا اصل اصول آزادی ہے۔ لیکن چونکہ فطرت انسانی کمزور ہے آسانی سے گمراہ ہوتی ہے اور اس کی عقل پر جذبات غالب رہتے ہیں۔ اس لئے فرد اور جماعت دونوں کے مفاد کی خاطر انسانی آزادیٔ افعال کو ایک دائرے میں رکھنا ضروری ہے۔ انسانی فعل و ارادہ پر لگنے والی پابندیاں اسلامی فقہ کی اصطلاح میں "حد" کہلاتی ہیں۔

ان حدوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو انسان کے روحانی وجود کی ضابطہ بندی کرتی ہیں۔ یہ عقیدے اور ایمان کی شکل و صورت بناتی ہیں اور ارکان دین روزہ، نماز حج، زکوٰۃ اور جہاد کی ادائیگی کو فرض قرار دے کے ان کی تفصیلات طے کرتی ہیں۔ یہ حدیں حقوق اللہ کے لئے مخصوص ہیں۔ حدوں کی دوسری قسم جو حقوق العباد پر مشتمل قانون کی درجہ بندی کرتی ہیں ان کا تعلق انفرادی زندگی کے معاملات اور مسائل سے ہے۔ حقوق اللہ کے مقابلہ میں حقوق العباد کچھ کم اہم نہیں۔ عقیدے کی نظری دنیا سے نکل کر عمل کی حقیقی دنیا میں آتے ہی قانون اسلام کا رویہ اور زیادہ سخت اور ناقابل تبدیلی ہو جاتا ہے۔ قانونِ اسلام میں دینی اور دنیاوی تقسیم نہیں ملتی۔ خدا کے حقوق اور بندے کے حقوق دونوں کا ادا کرنا مسلمانوں کا فرض ہے۔ وہ فقہ، اسلام کی اطاعت کے نتائج سے بہرہ ور ہو کے ایک طرف وہ فرد کو جماعت کے مفاد میں ضم کرتے ہیں اور

دوسری طرف اسلامی قانون کی اطاعت منشار خداوندی کی اطاعت ہونے کے سبب سے ان کے لئے نجات آخرت کا سبب بنتی ہے۔ شریعت ہمیشہ مسلمانوں کے فرائض بھی متعین کرتی رہی اور ان کے حقوق کی بھی حفاظت کرتی رہی ہے۔

○

فقۂ اسلام میں انسانی افعال کو پانچ بڑے خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ فرائض

۲۔ واجب

۳۔ مستحب

۴۔ مکروہ

۵۔ حرام

فرائض وہ افعال و اعمال ہیں جو مسلمانوں کے لئے خدا اور رسول کے براہ راست حکم کے بعد لازمی قرار پاتے ہیں۔ ان کی ادائیگی ہر مسلمان پر ضروری ہے۔ واجب وہ احکامات ہیں جو قیاس و اجماع کے بعد رواج پا گئے ہیں۔ مستحب وہ قانون ہیں جن کے پیچھے صرف اخلاقی قوت ہے۔ ان کی اطاعت مستحسن سمجھی جاتی ہے۔ مکروہ وہ اقدامات ہیں جو ملت کے اجتماعی ضمیر سے مطابقت نہ کھاتے ہوں۔ اور حرام وہ احکامات ہیں جن کو کتاب و سنت کے براہ راست ممانعت کے احکامات کا درجہ حاصل ہے۔

○

فقہ کی تاریخ میں غالباً قیاس و اجماع کے اصولوں کو اتنی مقبولیت اور وسعت حاصل نہ ہوتی اگر امام ابو حنیفہ (وفات ۷۶۷ء) اور انکے طریقۂ قانون سازی کا ظہور

ہوا ہوتا۔ وہ عباسی حکمرانوں کے زمانے میں پیدا ہوئے اور اگرچہ خود انھوں نے نظام حکمرانی میں کوئی عہدہ قبول نہیں کیا لیکن ان کے دو شاگردوں امام ابو یوسف اور امام شیبانی نے عباسی حکمرانوں کے تحت نظام عدلیہ کی رہنمائی کی اور ان کی وجہ سے عباسی سلطنت کا نظام عدل و انصاف فقۂ حنفی کے رنگ میں رنگ گیا۔ یہ بات اتنی ہی فطری تھی جتنی عباسی حکمرانوں سے پہلے فقہ کا قیاس الگ رہنا اور سابقہ روایات پر عمل کرنے پر اصرار کرنا تھا۔ عراق میں جہاں حنفی فقہ نے آنکھیں کھولیں وہاں سے پہلے فقہی معاملات میں ایک گروہ عراقی مکتبۂ فکر کے نام سے موجود تھا۔ یہ لوگ رائے کو تسلیم نہ کرتے تھے لیکن زور روایت ہی پر دیتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں مدینہ کا مکتبۂ فکر روایت کے مقابلہ میں رائے کو برداشت کرنے پر بھی تیار نہ تھا۔ اموی حکمرانوں کے زمانے میں بہر حال چونکہ ان کا زور نظام سلطنت اور تمدن میں عربی رنگ برقرار رکھنے کا تھا۔ اس لئے عراق و مدینہ کے مکاتب فکر کو ایک نوعیت کی سرکاری سرپرستی حاصل رہی۔ کیونکہ یہ تمام خارجی اثرات کے مخالف اور اسلام اور عربیت کو ایک سمجھتے تھے۔ مگر عباسی حکمرانوں کے زمانہ میں زمین و آسمان بدل چکے تھے۔ نہ صرف حالات و مسائل زیادہ تھے بلکہ وہ جذبۂ ایمان بھی عجمی اثرات سے کمزور پڑ گیا تھا جو اس سے پہلے لوگوں کو قانون کی بے چوں و چرا اطاعت کا سبق دیتا تھا۔ عباسی حکمرانوں کے زمانے میں امام اعظم ابو حنیفہ نے قانون سازی کے پیچیدہ نظام کو ذہانت و فطانت سے ایک نئے قالب میں ڈھال دیا۔ انھوں نے شریعت کے مزاج کو سمجھنے کی کامیاب کوشش کی اور قانون سازی کے اس مقصد کو جان لیا جو اسلامی تہذیب کی جان تھا اور فقہ کی روح، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے روایت پرستی، عرب کے مقامی رنگ اور تنگ نظری کی دیواروں کو توڑ کے رکھ دیا۔ حنفی فقہ نے قیاس کے ہتھیار سے

ذخیرۂ قانون کے ہر دشمن کا خاتمہ کردیا اور ایک ایسا حربہ قیاس فقہ کے ہاتھ میں دیدیا کہ رہتی دنیا تک وہ اپنے نت نئے دشمنوں کا مقابلہ بآسانی کرتا رہے گا۔ امام ابوحنیفہ قانون سازی کی راہ کھولنے والے نہ سہی کیونکہ ان کے پہلے رائے اور اجماع کا اصول رائج ہوچکا تھا مگر انھوں نے قیاس کو قانون سازی کی بنیاد کا بڑا حصہ بنا کے قانون سازی کی شاہراہ تعمیر کردی۔

مدینہ میں عربی سادگی، مساوات اور سنت رسول کی یادوں پر چراغ جل رہے تھے۔ یہ مقدس شہر اموی اور عباسی حکمرانوں کے شاہانہ کرّو فر سے پاک و بلند رہا تھا۔ یہاں رسول اللہ کے جاں نثار اصحاب کی چھوڑی ہوئی نسل، تعلیم، تربیت اور خو بو رکھتی تھی۔ لازمی طور پر یہاں کتاب اللہ اور سنت رسول کا بڑا چرچا تھا اور لوگوں کے ذہن عجمی اور یونانی اثرات سے پاک تھے۔ معاشرہ، سادہ تھا اور طبیعت و مزاج رسول اللہ ان کے خلفائے راشدین و اصحاب کرام کی محبت و اطاعت کے خوگر، اس لئے مدینہ میں امام مالک (وفات ۷۹۵ء) جیسے قانون ساز نے جنم لیا۔ انھوں نے مدینہ میں ایک معلّم قانون اور نظام عدل کے نگرانِ اعلیٰ کی حیثیت سے قانون کا جوڑھانچہ بنایا۔ اس میں کتاب اللہ کے بعد صرف سنت رسول کافی سمجھی گئی اور ذاتی رائے اور قیاس کو بالکلیہ مسترد کیا گیا انھوں نے احادیث نبوی، سنت رسول اور خلفائے راشدین کے طرز عمل کے قانونی کارناموں کو اپنی مشہور کتاب "الموطا" میں جمع کیا اور اپنے پیچھے ایک سادگی پسند اور اسلام کے اوّلین عہد کی قانون سازی کی اطاعت کرنے والا ایک گروہ چھوڑ گئے۔ فقہ مالکی ابتک خالص عرب علاقوں میں قبولیت عامہ رکھتا ہے۔

ایک صدی ہجری کے بعد امام شافعی (وفات ۸۲۰ء) نے ایک نئے فقہ کی

بنیاد رکھی۔ وہ امام مالک کے شاگرد تھے۔ اس لئے انھوں نے بڑی سختی سے سنت رسول کی اطاعت کا اصول بنایا۔ علم حدیث کافی ترقی کر چکا تھا۔ امام شافعی نے اس سے کھل کے استفادہ کیا اور حدیث کو قانون سازی کی ہدایت حاصل کرنے میں امام ابو حنیفہ کے اصول قیاس کو کھُل کر استعمال کیا۔ شافعی فقہ نے اس طرح روایت اور درایت کے درمیان ایک ایسا توازن قائم کیا جس پر عمل بالحدیث کا رنگ غالب تھا۔

غیر اسلامی اثرات کے خلاف شدید ترین ردِّ عمل اسلامی قانون سازی کی تاریخ میں دو سربرآوردہ فقیہوں نے بغداد میں ظاہر کیا جہاں معتزلہ نے کتاب اللہ اور سنت رسول کی دور از کار فلسفیانہ تعبیریں رائج کرنا چاہی تھی۔ عباسی حکمرانوں نے یونانی فلسفہ کی سرپرستی کے شوق میں قرآن اور حدیث کو بالکل فلسفہ بنانا چاہا تھا۔ امام داؤد ظاہری (وفات ۸۸۳ء) نے فقہ ظاہری کی داغ بیل ڈالی اور قیاس کا بالکل انکار کیا۔ وہ قرآن و حدیث کے متن کے عام مفہوم کی اطاعت پر زور دیتے تھے اور اصول قانون سے جزوی اور فروعی قانون سازی کے مخالف تھے۔ امام داؤد ظاہری نے اپنی شدّت پسندی سے قانون سازی کے میدان میں انارکی (Anarchy) اور ذہنی انتشار کا راستہ تو روک دیا مگر ان کی شدّت پسندی ہی ان کے فقہ ظاہری کو عام ہونے سے روکتی رہی۔ البتہ اسلامی فقہ کی پوری تاریخ میں بڑے بڑے قانونی ذہن امام ظاہری کی فکر و نظر سے برابر متاثر ہوتے رہے اور فقہ ظاہری کے تسلیم کرنے والوں میں بڑے بڑے قانون ساز نظر آتے ہیں۔

یوں ہی امام احمد حنبل (وفات ۸۵۵ء) نے غیر اسلامی اثرات اور معتزلہ کی قیاس زدگی کا کامیاب مقابلہ کیا۔ وہ بہت بڑے محدّث بھی تھے اور غیر معمولی طور پر نیک نفس، پرہیزگار اور خدا رسیدہ بھی۔ عباسی حکمرانوں کی سرکاری سرپرستی نے فلسفہ کو جو بلندی دے رکھی

تھی اس سے وہ ٹکرائے اور اس ٹکر میں قید و بند سختیاں بھی برداشت کیں کوڑوں کی مار بھی،
لیکن عمل بالحدیث اور اطاعت کامل کا سبق دینا بند نہیں کیا، انھوں نے رسول اللہ کے برگزیدہ
اصحاب کی وہ حدیثیں مسند احمد ابن حنبل میں جمع کیں جن سے شریعت و فقہ کی ابتدائی روایات
اور مثالیں مل سکیں۔ یہ کتاب آج بھی فقہ حنبلی کا مرکزی ذخیرۂ قانون ہے اور اس مجموعۂ قانون
پر اسلام کے عہد اوّلیں کا رنگ غالب ہے۔ فقہ حنبلی قیاس، اجتہاد اور رائے کا مخالف ہے
اور اسلام کی ابتدائی صدی کی شکل و صورت کو زندہ کرتا ہے۔ اندرونِ عرب نجد و حجاز میں
فقہ حنبلی ہمیشہ عام رہا اور اٹھارویں صدی میں امام محمد ابن عبدالوہاب (وفات ۱۷۶۵ء)
نے اس کی تجدید کی۔

فقہ کے یہ چاروں مذاہب (طریقے یا راستے) ظاہری تضاد اور تفصیلات میں اختلاف
کے باوجود ایک بنیادی وحدت ہیں۔ ان سب کا ماخذ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کا
کم و بیش استعمال ہے۔ یہ چاروں ایک دوسرے کو برحق تسلیم کرتے ہیں اور عالم اسلام کی اکثریت
انہی ائمہ اربعہ کے طریق قانون سازی میں سے کسی ایک کی پیرو ہے۔

قانون سازی کے اس تاریخ میں ایک چیز نمایاں ہے۔ وہ یہ کہ قانون کا ارتقا اسلامی
تہذیب میں اس طرح ہوا کہ بادشاہوں، سلطانوں اور حکمرانوں کے اقتدار قانون سازی کا نہ
رخ بدل سکا نہ اس کے ارتقاء پر گرفت کر سکا۔ ہر مسلم سلطنت میں نظام عدلیہ فقہ کے ماہروں
کے ہاتھ میں رہا اور قاضی اسلامی مملکتوں میں انصاف و عدل کا نظام سنبھالے رہے البتہ
بادشاہوں کے لئے ایک رعایت روا رکھی گئی وہ یہ کہ انتظامی معاملات میں ان کو دادرسی
کا مرتبہ دیا گیا اور مظالم کے تدارک کے لئے اپنے دربار کو عدالت کا نام دینے کی اجازت دی

گئی۔ مگر مسلم حکمرانوں کو دیوانی، فوجداری اور مالیاتی معاملات میں ہمیشہ فقہ کے ماہرین کی اطاعت کرنا پڑی جو اپنے آپ کو شریعت کا محافظ سمجھتے تھے۔ اور شریعت کے اصول کو نافذ کرنے کے لئے افراد یا جماعت کے باغیانہ طرزِ عمل کو سختی سے دباتے تھے۔

اپنی باقاعدگی کی وجہ سے اسلامی نظام عدل و انصاف نے اپنی برتری ہمیشہ برقرار رکھی۔ اس کا طریقۂ کار یہ تھا کہ جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو اس کی روداد تحریری طور پر مرتب کر لی جاتی تھی اور قاضی اس پر فتویٰ لکھ کر مقدمہ کا فیصلہ کرتا تھا۔ بعد میں جب عدالتی نظام پر حکمرانوں نے براہ راست تقررات شروع کر دئے، تب بھی عدالتوں میں عام قانون مملکت کے علاوہ مفتی مقرر کئے جاتے تھے جو قانون شریعت کی تعبیر کرتے تھے اور مقدمات میں فقہ کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے تھے۔ عباسی حکمرانوں کی مرکزی سلطنت کے خاتمے کے بعد فقہ اسلامی مختلف مقامی حکمرانوں کے ماتحت عدالتی نظام کی روح بنا رہا یہاں تک کہ دو عظیم غیر عرب سلطنتوں، آل عثمان نے ترکی میں اور مغلوں تاتاریوں نے وسط ایشیا اور ہندوستان میں فقہ اسلامی کو اپنایا۔ ہندوستان میں ۱۸۵۸ء تک اور ترکی میں ۱۹۲۶ء تک عدالتی نظام میں فقہ ہی کو بالادستی حاصل تھی۔

غیر عرب حکومتوں میں فقہ کے اصول و قوانین عربی سے ترجمہ کئے گئے اور ترکی، فارسی، اور اُردو میں قانونی ادبیات کا نوے فیصد حصہ منتقل ہو گیا۔ پھر عدالت کی زبانیں بھی مقامی زبانوں میں منتخب کی جانے لگیں یہیں سے علم فتاویٰ کو نئی زندگی اور اہمیت ملی۔ عربی کتابی فقہ کے متن و ماخذ سے استفادہ کر کے فتویٰ دئے جانے لگے انکی حیثیت بہت جلد ایسے قانونی مواد کی ہو گئی جو ایک طرف تو عدالتوں کے لئے نظیر کا کام دیتا تھا اور دوسری طرف اصول قانون اور قانون سازی کے ارتقا اور طریقے کے مطالعے کا

بہترین ذریعہ تھا یہ فتویٰ نویسی ایک الگ علمی شاخ بن چکی ہے جس کا مطالعہ فقہ اسلام کی تبدیلیوں اور ارتقا کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ فتاویٰ کے مجموعوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ مقامی مزاج اور ماحول کے تقاضے نے جسکو فقہ کی اصطلاح میں عادات کہا جاتا ہے، فقہ کے فروعات کو کتنا متاثر کیا ہے۔

اپنی تکمیل اندرونی قوت اور ایک بے مثل عقلی نظام ہونے کی وجہ سے فقہ ہمیشہ اسلامی تہذیب کی سب سے بڑی وجہ اتحاد ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اسکی بے لچک سختیوں نے اسلام کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے اور جگہ جگہ الگ الگ رنگ اختیار کرنے سے بچایا۔ یہ اسلامی روح کا بہترین مظہر، اسلامی فکر کا قومی تر اظہار اور نظام اسلام کا مغز ہے۔ چودہ صدیوں میں اسکی خاطر سب سے زیادہ قرطاس وقلم استعمال ہوئے اور ہر زمانے میں بڑے بڑے ذہن اسکی وسعت، نزاکت، خوبی اور گرفت کے قائل ومعترف ہوئے۔ فقہ، اسلام کا سب سے بڑا محافظ، خادم اور اس کا نگراں ہے۔

المعتزلہ

فقہ (قانون) کے پہلو بہ پہلو دینیات (عقاید) کو بھی خارجی اثرات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور اس کا ارتقا بھی اسلامی تہذیب میں انتشار پر مرکزیت کی فتح کی داستان ہے اسلام جو صحرائے عرب سے ایک مکمل نظام حیات کی صورت میں نکلا تھا جب ایرانی اور بازنطینی باجگزار کے علاقوں اور افریقہ و ایشیا کی وسعتوں میں پھیلا تو اُس نے اپنے نظام حیات کو ان تمام سرزمینوں پر نافذ و قائم کیا۔ لیکن سابقہ زوال پذیر تمدن و تہذیب نے جہاں بڑی آسانی سے اسلامی نظام حیات کی پختگی اور تناسب کے آگے ہتھیار رکھ دیے وہاں یہ بھی ہوا کہ ان علاقوں میں سابقہ ذہنی روایات کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی رہے اور انھوں نے آگے چل کر انتشار پیدا کیا۔

اسلام نجد و حجاز میں تو اپنی مکمل پاکیزگی کے ساتھ موجود رہا جو شکوک و شبہات سے ماورا اور ایماندار، اطاعت گزار اور بالغ نظر تھا، لیکن شام و فلسطین میں یونانی عیسائیت اور عراق میں زمانۂ قدیم کے سحر و کہانت، کشف و غیب بینی کے قائل فرقوں نے سر اُٹھایا۔

ایران میں سابقہ آتش پرستی کی روایات موجود رہیں جہاں ان علاقوں میں آبادی کی،
اکثریت نے اسلام کو پوری طرح اپنا لیا وہاں ایک چھوٹے حصہ نے اسلامی نظام حیات
میں اپنے قدیم تعصبات وعقاید کا پیوند لگانے کی کوشش کی۔ اس چیز نے ذہنی انتشار
کا راستہ کھولا، گو اس کی بڑی ذمہ داری ان سیاسی اختلافات پر تھی جو اموی حکمرانوں
کے تسلط کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ لیکن خود اموی حکمرانوں کے زمانوں میں یہ انتشار صرف
سیاسی رہا اور جو غلط عقائد وقتاً فوقتاً پیدا بھی ہوئے۔ انکو ختم کرنے کی پوری کوشش کی گئی
دمشق میں جو لوگ دنیا کی سب سے وسیع سلطنت گرفت میں رکھتے تھے۔ انھوں نے اس
خطرہ کو سمجھا تھا اور انھوں نے اپنے زمانے میں عربیت کو برتر برقرار رکھنے میں پوری
کوشش کی۔ یہ ظاہر ہے کہ سرزمین اسلام کی رنگا رنگی کو یک رنگ بنانے میں صرف
عرب ہی کامیاب ہو سکتے تھے۔ جن کی تمام تر زندگی پوری طرح اسلام کے رنگ میں ڈوبی
ہوئی تھی۔ عربوں کی غیر معمولی فتوحات نے ان کو ایک اخلاقی برتری دیدی تھی اور اسلامی
علوم کے اوّلیں ماہر اور تعبیر کرنے والوں کی حیثیت سے عربی فکر ونظر اسلام کی وسیع
سلطنت میں سب پر غالب تھے۔

○

مدینہ اس عربی اسلامی فکر کا اصل مرکز تھا۔ یہ وہ سرچشمہ تھا جہاں سے اسلام کی نہر پہلے
عرب ریگزار میں جاری ہوئی۔ فقہ اور دینیات نے یہیں عالم طفولیت سے قوت شباب تک
کا زمانہ بسر کیا۔ مدینہ میں قرآن نے آخری شکل وصورت اختیار کی۔ اس شہر میں رسول اللہ نے
اسلامی قانون اور معاشرہ کو عملاً قائم فرمایا۔ آپ کی حدیثیں مدینہ میں جمع ہوئیں اور مدینہ ہی
قرآن وسنت کا سب سے بڑا مدرسہ بن گیا۔ پہلی صدی ہجری میں عرب اور غیر عرب مسلمان

ہونے والے مدینہ کے مرکز کی طرف کھنچ کھنچ کر آتے تھے اسلام کی تعلیم اور تربیت کو ان لوگوں کی تفسیر وتعبیر سے پاتے تھے جنھوں نے یا خود رسول اللہ کی صحبت اُٹھائی تھی یا رسول اللہ کی صحبت اُٹھانے والوں سے فیض اٹھایا تھا اسلام کے اصل و خالص رنگ و روپ کا عالمی مرکز رسول اللہ کے اصحاب ان کے تابعین اور تبع تابعین کا شہر مدینہ عالم اسلام کے لئے مثالی درسگاہ تھا اور عرب سادگی و پختہ ایمان میں ڈوبا ہوا تھا۔

مدینہ کے مرکز نے ایک اور وجہ سے بھی اہمیت حاصل کی۔ اس نے دین و دنیا کے معاملات کو جدا جدا نہیں مانا اور نہ سیاسی اور دینی اقتدار کے فرق کو تسلیم کیا۔ اسلام میں دین و سیاست کی تفریق نہیں ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں اسلامی تہذیب کا سیاسی مرکز ہی دینی مرکز ہوتا تھا۔ لیکن دوسری صدی ہجری میں خلافت کا معیار کم ہوگیا اور پھر مسلسل اموی، عباسی حکمرانوں کے سلسلے اور خروج بنو فاطمہ نے اسلامی سیاست کو دنیاوی بادشاہت اور مادی اغراض کی آمیزشوں میں بدل دیا۔ اس طرح صرف فوجی اور مادی قوت سے تسلط کا رواج ہوا جس نے خلافت کی جگہ ایک قسم کی بادشاہت قائم کردی۔ لیکن مدینہ میں یہ نئی دستوری روایت کبھی قبولیت نہ حاصل کر سکی اور یہاں سے پختہ عقیدہ نے ہمیشہ بادشاہت کی مذمت اور دنیاوی تسلط اور اقتدار کے نتیجے میں دین و دنیا کی جدائی کی مزاحمت جاری رکھی۔ مدینہ کے علماء و فقہا کے طرز عمل کو پورے عالم اسلام کے علماء نے سراہا اور اسکی پر زور حمایت کی اور قیاس، اجتہاد اور اجماع سے کام لینے کے باوجود وہ اس معاملہ میں مدینہ کے مکتبہ فکر سے پورے متفق رہے۔ اس طرح مدینہ نے عالم اسلام میں وحدت قائم رکھی اور اگلی صدیوں میں نہ صرف فقہ بلکہ دینیات کے طرز عمل کو پہلی اور آخری بار طے کردیا کہ اسلام دین و دنیا کی تفریق جائز نہیں رکھتا۔

مدینہ کے مکتبہ فکر نے آخر خود عباسی حکمرانوں کے زمانے ہی میں اتنی طاقت حاصل کرلی کہ براہ راست غیر اسلامی اثرات سے کھل کر ٹکرا سکا۔ دینیات (عقاید) کے میدان میں یہ ٹکر یونانی فلسفہ کے قائل فرقہ معتزلہ سے ہوئی تھی۔ اس سے قبل بھی دینیات کے مسائل میں اعتدال و توازن عام قبولیت حاصل کر چکا تھا۔ طرح طرح کے گمراہ فرقوں کے خلاف جو ایران اور عیسائی روایات کے حامی تھے کامیابی سے جہاد کیا جا چکا تھا۔ اور عام فضا اسلام کے معتدل و متوازن تعبیر کرنے والے کیلئے ہموار تھی۔ اب معتزلہ سے جو مقابلہ ہوا وہ مابعد الطبیعات اور الٰہیات کے مسائل میں تھا۔ یہ مقابلہ دو صدیوں تک جاری رہا۔ سیاسی فلسفے کے حد تک اس اعتدال و توازن نے عالم اسلام کی بہت بڑی اکثریت کو شیعیت اور خارجیت سے ہٹا کر عام جمہوری نظریۂ حکومت کا قائل بنا دیا۔ یہ چیز بھی انتشار کو رفع کرنے والی ثابت ہوئی اور اُس نے انتہا پسندی ختم کر دیا جس کی بنیاد فقہ (قانون) اور دینیات (عقاید) کے انتہائی عجیب و غریب غیر متوازن نظریات پر چند گمراہ فرقوں نے رکھی تھی۔

○

مسلک اعتزال کا آغاز خود ایک درمیانی راستے کے اختیار کرنے سے ہوا تھا۔ خواجہ حسن بصری کے زمانہ میں واصل بن عطا (وفات ۱۳۱ھ/۷۴۸ء) نے اسکی بنیاد رکھی۔ وہ حسن بصری کا شاگرد رشید تھا۔ ایک دن حسن بصری کے سامنے خارجیوں اور مرجیئوں کے درمیان اختلاف کا معاملہ پیش ہوا۔ خارجی، گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر اور قتل کا مستحق قرار دیتے تھے اور مرجیہ کا قول تھا کہ ایمان لانے کے بعد کوئی شخص کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ کرے اسکو خارج از الاسلام نہیں کہا جا سکتا۔ خارجی اپنی شدّت پسندی کی وجہ سے حضرت عثمان اور

حضرت علی کو گناہ کبیرہ کا مرتکب اور اسلئے واجب القتل قرار دیتے تھے مگر مرجیہ اس سلسلے میں دونوں کا احترام کرتے اور انکے متعلق کسی فیصلے کو خدا کے ہاتھ چھوڑتے تھے۔ مرجیہ کا رویہ سیاسی میدان میں بھی خارجیوں سے بہت مختلف تھا۔ خارجی باری باری حضرت علیؑ اور حضرت معاویہ سے لڑ چکے تھے اور اب بنو امیہ سے ٹکرا رہے تھے۔ مرجیہ اس سلسلے میں بھی غیر جانبداری برتتے تھے۔ خواجہ حسن بصری کا خود رویہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کو سیاسی جھگڑوں سے بچنے اور اپنی انفرادی اصلاح کی رائے دیتے تھے لیکن انکے سامنے واصل بن عطا نے ایک درمیانی راستہ اختیار کرنے کی دلیل پیش کی اس پر انھوں نے کہا کہ ابن عطا نے ہم لوگوں سے اعتزال (علیحدگی) اختیار کی ہے اسکے بعد واصل ابن عطا کا مسلک، اعتزال کے نام سے مشہور ہوا اور اُسنے بہت کھل کے اسکی تبلیغ کی یہاں تک کہ اسلامی معاشرے میں ذہین طبقہ کا عام رویہ معتزلہ کی حمایت ہو گیا۔ مشہور ماہر لسانیات امام عمر بن بحر الجاحظ (وفات ۸۶۹ء) اور ماہر زبان داں ابن ابی الحدید شیعی (وفات ۱۲۵۷ء) مسلک اعتزال سے متاثر ہونے والے عرب علما کی بہترین مثال ہیں۔

معتزلہ اپنے کو اہل التوحید والعدل کہتے تھے۔ توحید سے انکی مراد ایک یکتا و بے ہمتا ذات کا ایسا تصور تھا جس میں صفات کو تسلیم نہ کیا جائے لیکن دوسری ہی سانس میں وہ عدل سے مراد یہ لیتے تھے کہ یہ ذات یکتا و بے ہمتا کائنات پر عدل و انصاف کے لئے قائم و نافذ ہے۔ انھوں نے خارجیوں سے مختلف ہونے کی خاطر تاویل کا طریقہ آزادی سے برتا اور آخرت کے عذاب و ثواب کی ایسی تشریح کرنے لگے گویا یہ اسلامی عقیدہ نہیں ہے۔ مرجیہ کہتے تھے کہ انسان اپنے افعال میں جبر مشیت کا گرفتار ہے، معتزلہ نے اس کی تردید میں اختیار انسانی پر زور دیا، بہر حال ان کا سب سے بڑا کارنامہ تاویل و قیاس

کے ذریعے عقاید کی تشریح کا ہے۔ قرآن کی تفسیر حدیث کی تعبیر اور فقہ اسلامی میں ترتیب احکامات کو تاویل و قیاس نے بڑی سہولیت مہیا کر دی اور ان تینوں علوم اسلامیہ کی ترقی میں بالواسطہ معتزلہ کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

معتزلہ نے اپنے آپ کو علم کی تحصیل و تدریس میں لگا دیا اور ان کے حلقے سے تفسیر، حدیث کی تنقید، تاریخ کے جائزے اور عربی لسانیات کی تحقیق کرنے والے بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے۔ انھوں نے کتابوں کے ترجمے، ان کی اشاعت اور لکھنے پڑھنے کے ذوق کو بہت بڑھا دیا۔ بنو امیہ کے زمانے میں انھوں نے بنو ہاشم کی حمایت کی تھی اس لئے عباسی حکمراں مامون الرشید (وفات ۸۳۳ء) کے زمانے میں معتزلہ کو دربار میں اقتدار حاصل ہو گیا خلق قرآن کے نظری جھگڑے کا بہانہ لیکر معتزلہ نے ان تمام عناصر کو نظام سلطنت سے خارج کرنا شروع کیا جو مسلک اعتزال سے اختلاف رکھتے تھے۔ امام احمد بن حنبل کو کوڑوں کی سزا دی گئی اور صدہا علمائے اسلام کو قید و بند اور دوسری سزاؤں سے نوازا گیا روشن خیالی کی نمائندگی کرنے والے معتزلیوں نے اس تنگ نظری کے بد نما مظاہرے کے بعد اپنے آپ کو عوام میں ناپسندیدہ پایا۔ مسلمان خیال کرنے لگے کہ معتزلہ کی روشن خیالی ایک بدترین عقیدہ پرستی ہے جس میں رواداری کا کوئی شائبہ نہیں جو روشن خیالی کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ عوام کے اس احساس نے معتزلہ کا اثر گھٹانا شروع کیا اور جب دربار عباسیہ سے انکا اقتدار اٹھا تو پھر وہ کبھی پنپ نہ سکے۔ پہلے واثق باللہ اور بعد میں المتوکل علی اللہ (وفات ۸۴۷ء) نے معتزلہ کو سرکاری عہدوں سے ہٹا کے مسلک اعتزال کی سرکاری سرپرستی کا خاتمہ کر دیا۔

انکی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ فکر و تصوّر کے حامل تھے۔ علم و فضل کی قدر

کرتے تھے اور تصنیف و تالیف میں انکو اتنا ہی انہماک تھا جتنا اپنے مسلک کے پھیلانے میں تھا۔ انکے زمانہ اقتدار میں عباسی دربار نے علم کی حقیقی قدر کی۔ وہ اسلام کے مخالف نہ تھے بلکہ تطبیق عقل و نقل (عقیدے اور فکر کے توازن) کے حمایتی تھے۔ انکی واحد اور بہت بڑی کمزوری ان کا تشدد تھا۔ ان کی اس شرمناک تشدد پسندی کی وجہ شاید یہ تھی کہ مسلک اعتزال کا آغاز پہلی صدی ہجری میں دو انتہا پسند نظریات کی ٹکر میں ہوا تھا۔ ایک طرف خارجی تھے جن کا یہ کہنا تھا کہ عمل کے بغیر آدمی مسلمان نہیں ہوتا۔ ان کے مقابلہ میں فرقہ مرجبیہ تھا جو یہ کہتا تھا کہ آدمی کیلئے صرف ایمان کافی ہے۔ معتزلہ نے یونان سے فلسفیانہ تصورات مستعار لئے اور خارجیوں کے قہر مطلق اور مرجیوں کے رحم مطلق کے مقابلہ میں عدل مطلق کا تصور پیش کیا اور اسطرح خارجیوں اور مرجیوں کے نظریات کے درمیان ایک راستہ نکالا۔ یہ معتزلہ کا بڑا کارنامہ تھا لیکن جب انھوں نے جبر و قدر کا مسئلہ اٹھایا تو اس میں وہ خود بھٹک گئے۔ ظاہر ہے کہ انسانی ارادے اور مشیت الٰہی کے بارے میں فلسفہ و منطق کی بحثیں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں کیونکہ یہ مسئلہ فہم عامہ اور عمل پسند طریقوں ہی سے حل ہو سکتا ہے۔ معتزلہ نے ایک دور از کار نکتہ یہ بھی نکالا کہ صفات خداوندی (سماعت، بصارت، ارادہ، رحم، عدل، جبر وغیرہ) کو وجود خداوندی سے منسوب کرنا توحید کے منافی ہے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ قرآن اللہ تعالیٰ نے الفاظ کے اعتبار سے خلق کیا ہے۔ یہ دعویٰ خود معتزلہ کے بنیادی فلسفہ سے ٹکراتا ہے اور معتزلہ کے مخالفین نے قرآن کو لفظ و معنی کے اعتبار سے غیر مخلوق قرار دے کے خود یونانی فلسفہ کے بڑے مشہور نظریئے کا سہارا لیا۔

معتزلہ کو آزاد فکر اور عقل پرست کہا جانا چاہئے لیکن ان کی روشن خیالی اسلامی

تہذیب کے دائرے میں فکر و نظر کی پرواز تھی۔ انھوں نے مرکز سے ٹوٹنے یا مرکز کو توڑنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے فکری راہنماؤں اور ایک علمی حلقہ کی حیثیت میں اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ وہ تمام علاقے جہاں یونانی اثرات اور ایرانی تاثرات موجود تھے خالص عرب کے سادہ اور صاف باطن مسلمانوں سے ذہنی اور فکری دوری رکھتے تھے یہ ذہنی اور فکری دوری ہی تھی جس نے پہلی صدی ہجری میں ان گمراہ فرقوں کو جنم دیا جن کا خاص مرکز عراق تھا۔ معتزلہ نے فقہ (قانون) کی تشریح و تعبیر میں ایسا رویہ اختیار کیا یہ حکم کے علاوہ ایک نوازش الہٰی بھی محسوس ہونے لگا۔ فلسفۂ قانون میں، عدل مطلق کا قیام معتزلہ ہی کا نظریہ تھا۔ معتزلہ نے دینیات (عقاید) کے پورے نظام کو اس طرح مرتب کیا کہ اس زمانہ کے بڑے سے بڑے ذہن کے لئے بھی دلفریب اور ساکت کر دینے والا نظام فکر بن گیا۔ معتزلہ نے انفرادی طور پر بڑی پاکیزہ شرعی زندگی کو اپنا شعار بنایا اور انھوں نے اپنی ذہنی قوت سے صرف اسلام کے تحفظ کا کام لیا وہ عرصۂ دراز تک عالم اسلام میں سب سے زیادہ علمی، سرگرم اور تعمیر پسند فرقہ رہے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے کہ سید الطائفہ خواجہ حسن بصری جیسے اعلیٰ مرتبت صوفی پر اور امام اعظم ابو حنیفہ جیسے زبردست ماہر قانون پر مسلک اعتزال کے گہرے اور نمایاں اثرات تھے۔ دوسری صدی ہجری میں معتزلہ نے قدیم عرب قبائل اور عراق کی ملی جلی نومسلم آبادی میں زبردست تبلیغی سرگرمیوں سے قدیم ذہنی گمراہیوں کا نام و نشان مٹا ڈالا۔ فلسفہ و الٰہیات سے لذت شناس ہو کے انھوں نے یونانی کتابوں کے مطالعہ اور ترجمہ کی روایت قائم کی اور عربی میں یونانی فلسفہ کا ترجمہ ایک ایسی عام تحریک کی صورت میں شروع ہوا جس نے اسلامی تہذیب کو نہ صرف فلسفہ بلکہ طب، ریاضی، اقلیدس، فلکیات اور جغرافیہ کے علوم سے بھی مالا مال کیا۔ یہ زمانہ معتزلہ کے

پورے اقبال کا زمانہ تھا۔ یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری میں وہ مدرسوں اور مسجدوں کے علاوہ حکومت کے نظم و نسق اور دربار شاہی پر بھی قابض ہو گئے تھے۔

اپنے دور عروج میں معتزلہ نے اپنے آپ کو یونانیات میں غرق کر دیا اور فقہ و شریعت کے متن و ماخذ کی جگہ یونانیات ہی پر اکتفا کرنا شروع کر دیا۔ فقہ و شریعت کو یونانیات کی خاطر توڑنے اور مروڑنے لگے۔ پھر انھوں نے اپنے مخالفوں کے ساتھ تشدّد کا برتاؤ کیا۔ یونانیات کے وسیلے اور بیکراں ماحول میں گم ہو کے انھوں نے اپنے آپ کو اسلامی معاشرے کے تقاضوں سے الگ کر لیا۔ روزمرہ کی زندگی میں وہ ایسے عقیدہ پرست گروہ بن گئے جو مخالفوں کے خلاف سازش، بدگوئی، تلوار اور ہر حربہ سے کام لینا جائز خیال کرے۔

○

ان کے اثرات سے قدیم طرز کے علمار نے بھی منطق اور عقل کا مطالعہ کیا۔ وہ اسلامی عقیدہ کی گرمی، رواداری، سادگی اور انسان دوستی کی علمبرداری کرتے تھے۔ اب انھوں نے معتزلہ کے خلاف عقل کے ہتھیار استعمال کئے۔ اعتزال پر یہ شاندار فتح تیسری صدی ہجری میں امام ابوالحسن اشعری نے بغداد میں اور امام ماتریدی نے سمرقند میں حاصل کی۔ اشعری نے یونانیات کو بالکل الگ رکھ کر اسلامی فقہ و منطق کی عمارت بنائی انھوں نے عدل مطلق کے نظریہ میں اضافہ کیا اور انسانی اختیار پر زور دیا۔ اسلام کے لئے اشعریت کا معتزلہ پر فتح پانا بہت اچھا ہوا۔ ورنہ اسلامی تہذیب کے لئے معتزلہ کی مرکز گریزی سخت خطرناک ہوتی۔ اس کے بعد معتزلہ کا ذہنی تحریک کی حیثیت میں کوئی اثر نہ رہ گیا البتہ انفرادی طور سے لوگ اعتزال کے پیرو رہے اور بعض مرتبہ بصرہ اور مشرقی ایران میں

بعض فرقوں اور خصوصاً شیعوں نے معتزلہ کے عقائد کو اپنے لئے استعمال کیا۔ لیکن یہ معتزلہ کی روح سے ناآشنا رہے۔ انھوں نے اعتزال کے مغز کا ذائقہ نہیں چکھا بلکہ صرف چھلکے ہی پر قناعت کی۔

رفتہ رفتہ اشعریت تمام عالم اسلام میں قبول عام حاصل کر گئی۔ اس کے اثر سے وہ گروہ پیدا ہوا جو متکلمین کے نام سے مشہور ہے۔ علم کلام نے قرآن و حدیث کی حمایت میں علوم ذہنی کا گہرا مطالعہ کرنے اور ان سے کام لینے کا سلسلہ قائم کیا۔ اشعریت ہی کے اثر سے فلسفہ و منطق، طب و ہندسہ، فلکیات و جغرافیہ اور ریاضی کو پر اسرار، مخفی اور آسمانی علوم کی جگہ جیتے جاگتے اور کارآمد علوم کا درجہ ملا۔ ان کا مطالعہ عام استفادہ کیلئے ہونے لگا اور یہ الہیات اور عقاید کی گرفت سے نکل کر اپنے سیدھے راستے پر آ گئے جس کی وجہ سے ہر ایک شعبۂ علم نے خصوصی مشاہدے اور، تحقیق، تدریس، تصنیف اور تالیف سے ترقی پائی اسلامی تہذیب کے وسطی زمانہ کے بڑے بڑے ذہنوں نے ان علوم کو ان کی صحیح جگہ متعین کر کے ترقی دی۔ الکندی (وفات ۸۷۲ء) الفارابی (وفات ۹۵۰ء) بوعلی سینا (وفات ۱۰۳۷ء) اور اندلسیہ کے ابن ماجہ (وفات ۱۱۳۸ء) اور ابن رُشد (وفات ۱۱۹۸ء) نے فلسفہ، طب اور علم کلام میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اشعریت کے اثر سے ان لوگوں نے مقاصد عظیم کو سمجھا اور قبول کیا تھا اور ان سب پر علم دوستی غالب رہی کہ مذہبی قیادت کا جذبہ ان کے دلوں میں کبھی نہیں ابھرا۔ اسلامی تہذیب کے درخشاں ذہنی کارناموں سے یورپ نے جب اپنی تعمیر جدید کا آغاز کیا تو انھیں لوگوں کی تصانیف عربی سے فرنگی زبانوں میں ترجمہ کی گئیں۔

○

اشعریت کی فتح یابی کے بعد بھی اعتزال کے اثر نے اس طبقہ کو برابر متحرک رکھا جو دینیات کے میدان میں عام فلسفے کے استعمال کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری خیال کرتا تھا۔ یہ علم کلام کے ماہروں کا طبقہ تھا جو عصری ذہن کے مطابق اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ کر کے انکو وقت اور ماحول کے لئے قابل قبول شکل میں ڈھال دیتا تھا اور جب اسلامی تعلیمات پر علمی میدان کے کسی گوشے میں اعتراضات ہوتے تھے تو سامنے بڑھ کے ان کا مقابلہ کرتا اور جوابی دلائل سے انکو شکست دیتا تھا۔

علم کلام نے غیر اسلامی اثرات کے مقابلہ کے علاوہ اندرونی انتشار کو بھی دور کیا۔ انکے سب سے بڑے نمائندے امام ابو محمد غزالی (وفات ۱۱۱۱ء) ہیں۔ مرکزیت اور اصل رنگ روپ برقرار رکھنے کے لئے متکلمین کی خدمات بڑی قیمتی ثابت ہوئیں۔ امام غزالی نے جس طرح اپنے زمانے میں فلسفے، تصوف اور منطق و الٰہیات کو اپنے تجزیے اور تحلیل سے سمجھا سمجھایا وہ علم کلام کے اصول کار کی بہترین مثال ہے۔ انکے زمانے میں یونانی تصورات نے الحاد پھیلادیا تھا اور تصوف کو فلسفے کی آمیزش کر کے ایک ایسا مرکب بنا دیا گیا جسکے اندر ایرانی آتش پرستی، عیسائی، رہبانیت اور دنیا سے فرار اور ہر طرح سے قید و بند سے آزاد ہونے کا روحانی مزاج سب موجود تھے۔ امام غزالی نے یونانی فلسفے و الٰہیات پر کھل کے تنقید کی اور ان کا درجہ متعین کر کے ثابت کر دیا کہ وہ انسان کو کائنات اسکے مقصد، خیر و شر اور انسانی زندگی کے کوئی بہتر اور مستقل معیار عطا کرنے کے ناقابل ہے اور اسکی حیثیت لفاظی و خیال آرائی سے زیادہ نہیں ہے۔ تصوف میں جو ایرانی عقاید اور فراریت آگئی تھی امام غزالی نے اس پر بھی زبردست تبصرہ کیا اور تصوف کی ایک ایسی شکل پیش کی جس میں فرد کو جماعت سے پورا تعلق رکھنا پڑے اور ذاتی نجات کی

جدوجہد میں وہ زندگی کی عام قدروں اور قانون الٰہی سے آزاد ہونے کی جگہ زندگی کے جذبات خیر کو رہنما بنا کے شریعت کی پابندی کرے۔ اسلامی تصوف کے لئے امام غزالی کی یہ تنقید ہر زمانے میں صحیح اور غلط تصوف کی کسوٹی بن گئی۔

انکے پہلو بہ پہلو علم کلام میں مرکزیت کے حامی اور انتشار کے دشمن دو اور جلیل القدر متکلمین کا نام تاریخ کے صفحات پر چمکتا ہے۔ یہ امام ابن تیمیہ (وفات ۱۳۲۸ء) اور انکے شاگرد حافظ ابن قیم (وفات ۱۳۵۰ء) ہیں انھوں نے اپنی ذہانت اور گہری علمیت سے دینیات میں غیر اسلامی افکار کے خلاف زبردست جنگ کی اور انکے ذہنی اثرات نے معتزلہ کے زمانے کی اس ذہنی مرعوبیت کو بالکل ختم کردیا جو فلسفے والٰہیات کی پیچیدگیوں نے خاص و عام کے لئے پیدا کر رکھی تھی۔ تصوف پر مزید احتساب کرکے امام ابن تیمیہ نے اسکو رہبانیت اور انفرادی نفسیات کے پھندوں میں گرفتار ثابت کردیا اور من کی دنیا میں بسنے کی جگہ افراد کو جماعت میں ملنے، جذب ہونے اور اجتماعی خیر سے وابستہ ہونے کو بہتر قرار دیا۔ وہ اسلامی تہذیب کو اپنے اصل تناسب میں لانے کی کوشش کرتے رہے اور انھوں نے اسکے تناسب و خوبی کی اس قدر مکمل تصویر کھینچی کہ تمام مرکز گریز اور منتشر مزاج طاقتوں کا انکے سامنے قلع قمع ہوگیا۔

اسلام کی ذہنی تاریخ میں مرجیہ، معتزلہ کی کشمکش نے بہت سے ذیلی فرقے پیدا کئے۔ اعتزال کا اثر تو بہت گہرا ہے۔ اثنا عشری اور اسماعیلی شیعوں کے ماسوا خود اہل السنت والجماعت میں معتزلہ کے فلسفیانہ افکار کا نمایاں اثر آج تک موجود ہے۔ دراصل یہ سارے فرقے اور خود مرجیہ اور معتزلہ عقیدے اور مذہب کے اختلافات کا نتیجہ نہ تھے بلکہ فلسفے منطق اور الٰہیات سے اس ابتدائی تعلق نے پیدا کئے تھے جو عربوں کو بنو امیہ کے زمانے میں

علوم یونانیہ سے ہوا تھا۔ جب فلسفے اور منطق کا علم عام ہوگیا تو عجیب و غریب عقاید اور لاحاصل بحثوں کا خاتمہ ہوا اور اعتزال کا اثر صرف تاویل کے اصول کی شکل میں مسلمانوں کی علمی دنیا میں باقی رہا۔ تاویل کا اصول کسی مذہبی عقیدے کو شعور و ادراک کی حد میں لانے کی اجازت کا نام ہے اور تاویل ہر زمانے میں علمائے اسلام نے بہرحال عملاً کی ہے اور اسکی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

ان پرانے فرقہ وارانہ جھگڑوں کی تفصیلات اسلامی فلسفے کی تاریخ کا دلچسپ باب ہیں۔ آج بھی ان سے عربوں میں یونانی فلسفے کے رفتہ رفتہ پھیلنے اور عربوں کو متاثر کرنے کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ ان گم شدہ فرقوں کی اب کچھ اہمیت نہیں لیکن ان کے نظام عقاید اور انکی فلسفیانہ دلیلیں امام ابن حزم قرطبی (وفات ۱۰۶۴ء) کی کتاب الفصل و الاحوال النحل میں اور امام ابوالفتح شہرستانی (وفات ۱۱۵۳ء) کی کتاب الملل والنحل میں محفوظ ملتی ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں دنیا کے تمام مذاہب کے پہلو بہ پہلو مسلمانوں کے ان گمشدہ فرقوں کے عقاید و خیالات بھی تنقید و تجزیے کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں جنھوں نے کبھی عالم اسلامی میں بڑی سرگرمی پیدا کی تھی مگر اپنی انتہاپسندیوں کے ہاتھوں خود اپنی زندگی کا خاتمہ کرڈالا صرف تین فرقے، سنی، شیعہ، خارجی اپنی ابتدا سے آج تک عالم اسلام میں زندہ و بیدار ہیں۔

○

معتزلہ کی تحریک نے اپنا سب سے نمایاں نشان اسلامی مدرسوں کی فضا اور انکے نصاب تعلیم پر چھوڑا ہے مدرسوں کے نصاب میں معقولات کی تدریس پر ہر دور میں گہری توجہ ان ہی کا اثر تھی۔ یہ مدرسے ابتدا میں تو خالص دینی مرکز تھے جن میں

عربی صرف و نحو، بلاغت، فقہ، اصولِ فقہ، تفسیر اور حدیث کی کتابوں کا حصہ غالب تھا لیکن دن بدن رنگ بدلتا گیا اور معقولات کی کتابیں بڑھتی گئیں اور ان کتابوں کے پڑھنے پڑھانے، انکی شرحیں لکھنے میں علمائے اسلام نے بہت زیادہ محنت صرف کرنا شروع کر دی۔

معقولات کا نصاب، مساحت، ہندسہ، اقلیدس، منطق، طب اور تاریخ پر زور دیتا تھا۔ عقلی علوم کے تین شعبوں: طبیعی، ریاضی، الٰہی میں تقسیم کی گئی تھی۔ طبیعی شعبے میں کیمیا، طبیعات مناظر المرایہ اور علم الاعضا شامل تھے۔ ریاضی شعبے میں حساب، الجبرا، مساحت، اقلیدس، فلکیات و ہیئت اور موسیقی شامل تھے۔ تیسرا شعبہ: الٰہی علم کا وہ تھا جو معتزلہ کی تحریک کو ہر زمانے میں نئے لباس پہنا کے زندہ رکھے رہا اس کے دائرے میں الٰہیات، بنیادی فلسفہ علم دین کا عقلی تجزیہ اور تاویل شامل تھے، امام غزالی نے احیائے علوم الدین میں جس نظام تعلیم کا خاکہ کھینچا، وہ ایقان پرستی کیطرف لیجانے والا ہی، مگر اسکے خدوخال معقولات کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بعد کے زمانوں میں ملا نظام الدین فرنگی محلی کا مرتب کیا ہوا نصاب: درس نظامیہ معقولات سے معمور ہے اسی طرح خاندان خیرآباد کے سلسلۂ علما کے بانی مولانا فضل امام کا سرمایہ فخر معقولات ہی کا علم تھا۔

اس رجحان نے ان مدرسوں کو تمدن و تہذیب کے دنیاوی شعبوں کیلئے بھی مفید بنا دیا تھا۔ قدیم حکومتوں کے نظم و نسق کو کارکن اور سماج کو بیشمار طبیب، مہندس، ماہران فلکیات اسلامی مدرسوں نے قاضیوں، اور علماء کے ساتھ ساتھ فراہم کئے اس کا سہرا معتزلہ کے سر بندھنا چاہیے۔ انکی وجہ سے علم و عمل کی سرحدیں مل گئیں تھیں۔

تین فرقے

اسلامی تہذیب، قانون اور ادبیات میں ایک مرکزی وحدت ضرور ہے۔ توحید، رسالت اور شریعت کو ناطق و کامل تسلیم کرنے میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر یکساں اور فرقہ داری اختلاف سے بلند ہے مگر ابتدا رہی سے رسول اللہ کی دنیاوی حیات کے خاتمے کے بعد سیاسی نظام کے سوال پر سیاسی اختلاف پیدا ہوگیا تھا جو شروع میں تو صرف وقتی چیز معلوم ہوتا تھا مگر بعد میں مسلسل سیاسی کشمکش نے اسکو مستقل بنادیا۔ اس سیاسی اختلاف کی تاریخ میں تین اہم نقطۂ نظر کارفرما تھے اور ان ہی کی وجہ سے اسلام میں اہل سنت والجماعت، الشیعہ اور الخوارج کے فرقے قائم ہوئے جو اب تک موجود ہیں۔

اصل مسئلہ نظام سیاسی کی ہئیت کا تھا۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں عرب کے نمایندہ عناصر کے اتفاق رائے سے حضرت ابوبکر کو زمام خلافت سونپ دی گئی تھی اور عام طور سے مسلمانوں نے اس انتخاب کو تسلیم کر لیا تھا مگر بنو عباس، بنو فاطمہ اور بنو امیہ کو یہ خیال تھا کہ رسول اللہ سے خاندانی اور نسلی قرابت کی بنا پر خلافت ہمارا حق ہے، انہی تینوں

گھرانوں کے اس خیال سے آگے چل کر خانہ جنگی اور خوں ریزی کی صورت اختیار کرلی کیونکہ یہ گھرانے سلطنت کو اپنا موروثی حق سمجھتے تھے اور چاہے عام مسلمانوں کے انتخاب سے خلافت ملے یا خروج کرکے حاصل کی جائے ہر صورت میں اسکے خواہاں اور طلب گار تھے اس طلب و تمنّا میں انھوں نے نہ سازشوں سے پرہیز کیا نہ اصول شکنی سے، البتہ تینوں کی قدر مشترک یہ ہے کہ تینوں نے عام مسلمانوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے مسلمانوں کی اس محبت سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جو مسلمانوں کو اپنے مقدس و محترم رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی۔

حضرت ابوبکر کے بعد حضرت عمر کے زمانے تک یہ سیاسی جھگڑا دبا رہا۔ حضرت عثمان کا زمانہ آیا تو انکی غیر ضروری نرمی اور کمزوری نے جان لیوا انکے سر اُٹھایا۔ ایک پرجوش طبقہ انکی انتظامی پالیسیوں سے ناخوش تھا اور بنو امیہ کے اس اقتدار سے جلتا تھا۔ جو انکو حضرت عثمان کے خلیفہ ہونے سے حاصل ہو گیا تھا۔ اس طبقہ نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ جس طرح مسلمانوں نے اپنی بیعت سے حضرت عثمان کو خلیفہ بنایا ہے اسی طرح وہ فسخ بیعت سے انکو معزول کریں ۔ یہ مطالبہ اپنی جگہ اس جمہوری روایت کا عکس تھا جسکی بنا پر اب تک سیاسی نظام میں مسلمانوں کے انتخاب سے امیر المومنین مقرر ہوتا تھا۔ لیکن حضرت عثمان نے حالات کا صحیح اندازہ نہیں کیا اور یہ سمجھا کہ خلافت سے دست برداری کا مطالبہ کرنے والی جماعت کمزور ہے اور مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی مخالفوں نے مدینہ میں آکے حضرت عثمان کو گھیر لیا تھا اور آخر طویل گفت و شنید کے بعد جس میں حضرت علی نے حضرت عثمان کے روبرو معزولی کا مطالبہ کرنے والے طبقے کی ترجمانی کی تھی، حالات اسقدر بگڑ گئے کہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ

کو حضرت عثمان بھوکے پیاسے مخالفوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ مدینہ میں لوگ ان انقلاب پرستوں سے اسقدر دہشت زدہ تھے کہ حضرت عثمان کی تین دن تک تجہیز و تکفین نہ ہو سکی۔ بنوامیہ کے سرکردہ لیڈر امیر معاویہ تھے جو شام میں بڑی مضبوط و مستحکم حکومت پر قابض تھے، انھوں نے حضرت علی کی خلافت کے مقابلے پر اپنی متوازی خلافت قائم کر لی، اس کام میں انکو بڑی مدد بنوامیہ کے بااثر قبیلے کے افراد نے اس لئے دی کہ وہ حضرت علی کے کئی نمایاں حامیوں کو حضرت عثمان کے قتل میں شریک سمجھتے تھے۔ اب خون عثمان کے قصاص کا مسئلہ پیدا ہوا۔ حضرت علی کے لئے مشکل یہ تھی کہ قاتلان عثمان ہی کا گروہ ان کا دست خاص بنا ہوا تھا۔ سیاسی مصلحت کا تقاضہ تھا کہ وہ ان سے بگاڑ نہ پیدا کرتے کیونکہ ان سے بگاڑ کے معنی یہ تھے کہ امیر معاویہ کے مقابلے میں وہ خود بے دست و پا ہونا منظور کرتے۔ قاتلان عثمان کا یہ گروہ جس نے زہد و انقلاب کو ملا جلا کے اپنا سیاسی مسلک بنایا تھا، آگے چلکر خارجیوں کے نام سے مشہور ہوا اور بہت جلد اس نے حضرت علی کا بھی ساتھ چھوڑ دیا جسکی وجہ امیر معاویہ سے معرکہ آرائیوں کے بعد حضرت علی کا نرمی، درگزر اور صلح پسندی سے کام لینا تھا۔ خارجیوں نے مسئلہ تحکیم کو بہانہ بنا کے حضرت علی سے علیحدگی اختیار کر لی اور اب انکے خون کے بھی پیاسے ہو گئے یہاں تک حضرت علی کو حجاز میں خارجیوں کے ان اثرات کے سبب سے جو خانہ بدوش قبائل میں پھیل رہے تھے، مرکز خلافت مدینہ سے عراق میں کوفے منتقل کرنا پڑا اور آخر وہیں حق انتخاب کے منفی استعمال کے قائل خارجیوں نے انکو شہید کر دیا۔

○

یہی وہ زمانہ تھا جس میں سنی، شیعہ، خارجی: تینوں فرقوں کے ابتدائی خدوخال

وضاحت سے طے ہو گئے اور بعد میں موشگافیوں اور دلائل و عقاید کے اضافے ہوتے رہے اور یہ تینوں فرقے اپنے خیالات، عقیدے اور عمل کی تفصیلات میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہو گئے۔

حضرت علی کے پکے حامیوں کے فرقے: شیعوں نے یہ سمجھا کہ خرابیوں کی جڑ مسلمانوں کو انتخاب خلافت کا مل جانا ہے، جو حالات اور ماحول کے اعتبار سے کبھی کسی اور کبھی کسی شخص کی حمایت کراتا ہے۔ لہذا انھوں نے عقیدہ بنایا کہ مسلمانوں کی حکمرانی صرف حضرت علی اور ان کی اولاد کا حق ہے۔ وہ خلیفہ نہیں ہونگے بلکہ امام ہونگے اور ان کو نص قرانی کے ذریعے مقرر سمجھا جائے گا۔ حضرت علی کو شیعوں نے رسول کے بعد مسلمانوں کا جائز قاید مانا اور سابقہ خلفار کی خلافت کو غاصبہ (چھینی ہوئی) قرار دے دیا۔

اہل سنت والجماعت نے یہ سمجھا کہ مسلمانوں کو خلیفہ منتخب کرنے کا عام حق ہے مگر ان کو ہمیشہ ہر اعتبار سے بہتر آدمی کا انتخاب کرنا چاہیئے، چنانچہ حضرت علی کے مقابلے میں انھوں نے حضرت معاویہ کو کمتر قرار دیا اور سیرت و کردار کے اعتبار سے خلفائے راشدین کا شمار حضرت علی پر ختم کر دیا۔

وہ بنوامیہ، بنو عباس اور بنو فاطمہ کے دور حکومت میں برابر ان حکمرانوں کو جائز تسلیم کرتے رہے جو سیرت و کردار کے اعتبار سے بہتر ہوں اور جنکی سلطنت میں قانون شریعت پر عمل ہو۔ اہل سنت کا یہ بھی طرز عمل تھا کہ وہ حکمرانوں کی خرابی کو برداشت کرنا زیادہ بہتر سمجھتے تھے مگر تلوار اٹھا کے باہمی آویزش کو پسند نہیں کرتے تھے۔

الخوارج نے اس معاملے میں سنیوں اور شیعوں دونوں سے الگ اور انکے خیالات و عقاید کے درمیان تشدد پسندی کا رویہ اختیار کیا۔ انھوں نے یہ قرار دیا کہ مسلمانوں پر

صرف اپنے لئے بہترین حکمران منتخب کرنا ہی فرض نہیں ہے۔ بلکہ ان پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ غلط کار حکمراں کو بزور شمشیر اقتدار سے الگ کریں۔ خارجی اس بات کے قائل نہ تھے کہ حکمرانی صرف قریش کا حق ہے نہ وہ حقوق حکومت کو نسلاً بعد نسل کسی خاندان اور گھرانے کا حق تسلیم کرتے تھے۔

ان ابتدائی خدوخال کے ماسوا بعد کے زمانوں میں ان تینوں فرقوں نے بیرونی حالات کے تحت بہت سے اضافوں اور ترمیموں کو قبول کیا لیکن پہلے سیاسی اختلاف کے اثرات ان میں سے کسی کے نظام عقائد سے الگ نہیں ہو سکے۔ ان فرقوں کے نظام عقاید میں جو فلسفیانہ اور نظری موشگافیاں ہیں ان سے قطع نظر، ان کے اختلاف کی اصل بنیاد اب تک وہی مسئلہ ہے جس نے ان تینوں کے اختلاف کو پیدا کیا ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں کی سیاسی تنظیم و مرکزیت کی شکل کیا ہو اور یہ کن اصولوں پر تعمیر کی جائے؟

اس سیاسی سوال کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ اسلام ایک عملی دین ہے۔ اس کو اپنا قانون نافذ کرنا ضروری ہے۔ جہاں مسلمانوں کی حکومت وہاں حکومت کے ذریعے اور جہاں انکی حکومت نہ ہو وہاں اپنی تنظیم کے ذریعے مسلمانوں پر اپنے قاعدے قانون کی حفاظت اور اپنی تہذیب و عقاید کی حفاظت فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تینوں فرقوں کے اختلاف اب بھی قائم ہیں کیونکہ ان کا رویہ الگ ہے۔ یہ توحید، رسالت اور شریعت کے معاملے میں متحد لیکن نظام شرعی کی ہیئت ترکیبی کے سوال پر ایک دوسرے سے متضاد راہ رکھتے ہیں۔

دنیا کے مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد اہل سنت و جماعت کی ہے انکے بعد شیعہ ہیں اور سب سے کم تعداد میں خارجی ہیں۔

○

خارجیوں کا سیاسی نظریہ اُنکی جدوجہد اور عقاید کی طرح انتہا پسندی رکھتا تھا۔ شروع ہی سے یہ لوگ زہد و اتقا اور حقوق و فرائض کی ادائیگی میں غلو برتتے چلے آرہے تھے جسکی وجہ سے انکو پہلے پہل اہل قراء (قران کی بکثرت تلاوت کرنے والے) اہل الصوم والصلوٰۃ (روزے نماز میں بری طرح مشغول رہنے والے) کہا جاتا تھا۔ وہ خود اپنے کو اہل الشوریٰ (باہمی مشورے سے کام کرنے والے) کہتے تھے مگر جب معاویہؓ علی کی متوازی حکومتوں کی زمین ان پر تنگ ہوگئی تو انھوں نے عراق اور حمص و شام کے علاقوں سے نکل کے عرب کے صحراؤں میں بسیرا لیا جہاں کی سادہ وسعت زندگی ان کے لئے حفاظت کا سبب بھی تھی اور انکے عقاید کے لئے سازگار بھی، اب وہ اپنے کو سورۂ النسا کی آیت (۱۰۰) کے مطابق ان لوگوں میں شمار کرنے لگے جو خدا کی راہ میں گھر بار چھوڑ کے (وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ) ہجرت کریں اس طرح ان کا نام خارجی مشہور ہوا واقعہ بھی یہی تھا کہ رفتہ رفتہ یہ لوگ۔ اموی اور عباسی گھرانوں کے زیر تحت شاداب و آباد علاقوں سے خارج ہوتے گئے اور آخر ان کے ایک جلیل القدر رہنما امام عبداللہ بن اباض (وفات سنہ ۴۹ھ ۶ء) نے مسقط و عمان کے دور دراز علاقے میں خارجی نظام سیاسی قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی، ان کے نام سے موسوم ' اباضیہ فرقے نے ہزار سال کی مدت میں اب تک برابر اپنا امام مقرر کرکے خود کو اسکے تابع رکھا ہے اور آج امام عمان اباضیہ سیاسی نظام کے مظہر اور مسقط و عمان کے دینی حکمراں ہیں۔ اباضیہ کے عقاید میں یہ بات شامل نہیں کہ جو لوگ کسی نسلی یا خاندانی سلسلے کو حکمرانی کا مستحق مانتے ہیں وہ کافر اور واجب القتل ہیں بلکہ یہ مسلمانوں کے دوسرے فرقوں سے

رواداری برتتا ہے، خارجیوں کے اثرات افریقہ کے کناروں تک پھیلے ہیں اور آج بھی جنوبی الجزائر، وسطی افریقہ کے بعض بربر قبائل میں اور زنجبار و سومالی لینڈ کے علاقوں میں خارجی فرقہ موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خارجی نظریے، عقاید اور انکی جدّ و جہد سے بڑی ناانصافی کی گئی ہے، انکی سخت گیری اور تشدّد نے انکو بدنام کردیا ورنہ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ ہی سے وہ عربی ادب کو نظم و نثر کا ایک ایسا سرمایہ دے چکے ہیں جس کی تاثیر، گرمی اور شدّت یہ بات ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ ان تخلیقوں کے پس پشت فکر و جذبے کی کامل صداقت تھی لیکن بہرحال انکے نقوش تاریخ سیاست اسلامی پر گہرے اور کبھی نہ بھلائے جاسکنے والے ہیں۔ خارجیوں نے نسلی اور خاندانی گروہوں کے حق حکمرانی سے انکار کرکے مسئلہ خلافت پر معقول، جمہوریت پسند اور ہر لحاظ سے ایک بہتر قانونی نظریہ چھوڑا وہ اس اصول کے پوری شدت سے قائل تھے کہ حکمراں منتخب کرنا عام لوگوں کا حق ہے اور اس حکمراں کا کسی خاص گھرانے یا نسل سے ہونا ضروری نہیں اس بات کو وہ منطقی طور پر آخری حد تک لے جاکے یہ کہتے تھے کہ جس طرح انتخاب امیر فرض ہے اسی طرح سیاسی نظام کو پاک صاف رکھنا لازم ہے اور جب بھی اقتدار غلط ہاتھوں میں ہو تو بیعت کا فسخ کرنا اور تلوار اٹھانا ضروری ہو جاتا ہے۔ خارجی بے لاگ سیاسی احتساب کے سچے حامی تھے اور انھوں نے ہمیشہ اپنے اس نظریے کے لئے جان و مال کی گراں بہا قربانیاں دیں اور خاندانی و ذاتی عناد رکھنے والے حکمرانوں سے کھل کے ٹکر لی۔

O

جب رسول اللہ سے قرابت کے سہارے پر بنوامیہ کے خلاف بنو ہاشم (آل عباس و

آل فاطمہ) اپنی تحریک انقلاب میں کامیاب ہوئے تو اقتدار کی عنان عباسی گھرانے کے ہاتھ میں آگئی جو اس جدوجہد کے فوجی محاذ پر پیش پیش تھا اقتدار پاتے ہی انھوں نے بنو فاطمہ کو سیاسی خطرہ قرار دے کے ان کے خلاف سیاسی اقدامات شروع کردیئے اور ان پر بڑی زبردست سختی کی وہ بنو فاطمہ کے سرگروہ اثنا عشری اماموں کو تشدد کا نشانہ بنائے رہے اور ان میں سے اکثر کو زہر دیدیا گیا۔ یہ اثنا عشری امام حضرت علی کے چھوٹے لڑکے حضرت حسین کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے خود کسی نے کبھی تلوار اٹھا کے خروج نہیں کیا، لیکن یہ قرابت رسول اللہ کے قدیم دعوے کے مطابق اپنے کو حکمرانی کے مستحق خیال کرتے تھے۔ یہی چیز حکمراں عباسی گھرانے کو ان کے خون کا پیاسا بنائے ہوئے تھی آخر اثنا عشری امام محمد المنتظر نے ۸۷۳ء میں غیوبت اختیار کی اور اثنا عشری عقیدے کے مطابق وہ پھر ظاہر ہو کے اپنے گھرانے کے اقتدار کو کبھی نہ کبھی قائم کرینگے، روایت یہ ہے کہ وہ قیامت کے قریب ظاہر ہونگے اس لئے انکو حجت آخر زماں اور امام آخرالزماں کہا جاتا ہے۔

امام محمد المنتظر کی غیبت کے بعد ہی شیعہ فرقے کے موجودہ قالب نے پختہ شکل اختیار کرلی اور اس کے اصول و احکام کتابی صورت میں مدون کرلئے گئے جسکی وجہ سے وہ تمام غالی (انتہا پسند) اور گمراہ فرقے اثنا عشری شیعوں سے خارج ہوگئے جنھوں نے حلول و تناسخ کے عقاید کو شیعت سے ملا جلا دیا تھا اور حضرت علی اور انکی اولاد میں بعض حضرات کو خدا کا پیکر کہتے تھے۔ یہ اصول و احکام تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں مرتب ہوئے ہیں جو مسلک اعتزال کے شباب کے زمانے تھے اسلئے ان کے معقولات میں اعتزال کا رنگ جھلکتا ہے اور اولیں شیعہ علماء و مجتہدین میں سے اکثر معتزلی

نظر آتے ہیں، جنکی واضح مثال ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ ہیں۔ کتابی تدوین سے
سے شیعیت کو بڑا فائدہ پہونچا۔ اثنا عشری احکام و اصول کی اساس چار کتابوں پر ہے
جو احکام اسلام کی تشریح احادیث ائمہ کے توسط سے کرتی ہیں۔ یہ عقاید و احکام قرانی
کی تفسیر اور خود احکام عقاید و معاملات کا درجہ رکھتی ہیں (۱) اصول و فروع کافی:
یہ شیعی حدیث کا جامع ذخیرہ ہے اسکے مرتب ثقتہ الاسلام علامہ ابو جعفر محمد بن یعقوب
رازی کلینی (وفات سنہ ۹۳۹ء) ہیں۔ (۲) من لایحضرہ الفقیہ: یہ فقہ اور حدیث کا
ذخیرہ ہے علامہ علی بن حسین موسیٰ ابن بابویہ (وفات سنہ ۹۷۶ء) اسکے مرتب ہیں (۳)
تہذیب الاحکام (۴) استبصار: یہ بھی فقہ و حدیث کی کتابیں ہیں ان کے مرتب
علامہ ابو جعفر ثالث محمد بن حسن طوسی بغدادی ہیں۔ یہ کتب اربعہ (چار کتابیں) اثنا عشری
عقاید و احکامات قانون کی اساس ہیں اور مستند متن کا درجہ رکھتی ہیں۔ علامہ سید
شریف رضی (وفات سنہ ۱۰۴۴ء) نے حضرت علی کے خطبات و فرامین کو جمع کر کے اس
کا نام نہج البلاغہ رکھا اس سے عقاید شیعہ کا استنباط کیا جاتا ہے۔

شیخ صدوق ابو جعفر ثانی (وفات سنہ ۹۴۲ء) کی تفسیر الائمہ کے علاوہ علی بن
ابراہیم قمی کی تفسیر قمی ابو نصر محمد بن مسعود عیاشی کی تفسیر عیاشی، علامہ محمد محسن بن مرتضیٰ
کاشانی (وفات سنہ ۱۶۷۹ء) کی تفسیر صافی اور مجتہد العصر ملا محمد باقر مجلسی کی تفسیر کو شیعہ
تفاسیر میں عام قبول و اسناد حاصل ہے۔ ایران میں صفوی بادشاہوں کے زمانے میں
اثنا عشری فقہ کو زبردست ترقی ہوئی اور ایران کے سرکاری مذہب کے طور پر اثنا عشریت
کے نفاذ نے توجہ کا رخ عقاید کی دور از کار بحثوں اور موشگافیوں سے پھیر کے انسانی
معاملات و مسائل کی طرف موڑ دیا اسی لئے صفوی دور میں قانون کے شیعہ ذخیرے

میں اہم اضافہ ہوا اور شریعت پر توجہ نے مرکزیت کے احساس کو جگایا اس دور کے سب سے بڑے نمائندے ملا محمد باقر مجلسی (وفات ۱۶۹۹ء) ہیں۔

ایران میں اثنا عشری فرقے کو ایک چالاک حریف سے مقابلہ بھی کرنا پڑا۔ مشہور عالم معقولات ملا صدرا (وفات ۱۶۴۰ء) کے فلسفیانہ نظریات سے متاثر ہوکے ایک شیعہ عالم، شیخ احمد الاحصا (وفات ۱۸۲۶ء) نے شیعی تصوف و باطنیت کی تحریک شروع کی۔ ان کے پیروں کو فرقہ شیخیہ کہا جانے لگا۔ یہ اس بات کے قائل تھے کہ روحانی ریاضتوں کے ذریعے ارتقا کرکے امام غائب سے ربط قائم کیا جاسکتا ہے یہ لوگ امام غائب سے ایسا ربط قائم کرنا ضروری قرار دیتے تھے۔ مگر شیعی علمار کی شدید مخالفت نے اس فرقہ کو ختم کردیا لیکن اسکے اثرات ایران کی مذہبی اور سیاسی فضا میں برابر باقی رہے اور آخر انھوں نے بابی اور بہائی تحریکوں کی شکل اختیار کرکے ایران میں اپنے لئے ایک مستقل جگہ بنالی۔

○

اثنا عشری اماموں کے سلسلے میں چھٹے امام جعفر صادق (وفات ۷۶۵ء) کے بعد جانشینی کے سوال پر جھگڑا کھڑا ہوگیا انھوں نے اپنے بڑے لڑکے اسماعیل کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا مگر وہ باپ کی زندگی ہی میں وفات پاچکے تھے اس لئے امام موسیٰ کاظم (وفات ۷۹۹ء) کو جانشینی حاصل ہوگئی۔ مگر بعض لوگوں نے کہا کہ چونکہ امام نص الٰہی سے مقرر ہوتا ہے۔ لہٰذا اسماعیل ہی امام ہیں اور اب سلسلہ امامت اُنکی اولاد میں منتقل ہوچکا ہے۔ یہ لوگ محمد المکتوم ابن اسماعیل کو امام برحق مانتے تھے اور اسماعیلیہ کہلاتے تھے۔ سب سے زیادہ حکومت کے لیے سیاسی چالیں اسماعیلی فرقے ہی نے چلیں۔

فرقہ باطنیہ کا مشہور شیخ الجبال حسن بن صباح (وفات ۱۱۲۴ء) اسماعیلی مبلّغ تھا اسماعیلیوں کی دعوت بڑے وسیع خفیہ نظام میں سارے مسلم ممالک میں پھیلی ہوئی تھی یہاں تک کہ محمد المکتوم بن اسماعیل کے نسل سے ایک طالع آزما فرد: سعید بن حسین نے امام عبیداللہ المہدی کے نام سے افریقہ کے ساحلی کناروں پر اپنی سلطنت قائم کرلی اور ۹۳۴ء میں اپنی موت تک اسکو برّی و بحری لشکروں سے خوب آراستہ و قوی چھوڑ گیا ابھی تیسری پشت تھی کہ قائم کے جانشین المعز (وفات ۹۷۵ء) نے مصر پر بھی قبضہ کرلیا۔ اسماعیلی فاطموں کی یہ جلیل و جمیل سلطنت ۹۶۹ء سے ۱۱۷۱ء تک قائم رہی۔ انکے زمانے میں صنعت و حرفت، علوم و فنون اور تجارت نے بڑی ترقی کی اور ان اسماعیلی تاجداروں کا شمار آج ایشیا کے نامور گھرانوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ دنیاوی حکومت کے علاوہ اسماعیلی سلسلہ امامت کے امام مطلق بھی ہوتے تھے اور ان کا حلقۂ اعتقاد و تبلیغ انکی حدود سلطنت سے بہت دور تک پھیلا رہتا تھا۔ انکے دور میں مصر علوم عربیہ کا مرکز بن گیا تھا۔ آخر یہاں بھی فاطمی خلیفہ و امام ابوتمیم المستنصر باللہ (وفات ۱۱۰۱ء) کی جانشینی کے سوال پر معرکۂ کارزار گرم ہوا اور ان کے دو بیٹوں امام نزار اور امام مستعلی باللہ نے بیک وقت تخت کا دعویٰ کیا جس کا نتیجہ خانہ جنگی میں نکلا، اور مستعلی باللہ کے حامیوں کو آخر شکست اٹھانا پڑی انکے پوتے کی اولاد میں ایک کم سن لڑکے امام طیب تھے۔ اُنکے معتقدین یمن لے گئے اور وہاں انھوں نے امام غائب کی حیثیت اختیار کرلی چنانچہ بوہرے انہی ابوالقاسم طیب کی امامت غائبہ کے قائل ہیں اور امام غائب کے داعی مطلق ملّا طاہر سیف الدین کو معاملات شرعی میں رہنما تسلیم کرتے ہیں۔ امام نزار کی اولاد مصر میں فاطمی حکومت کے خاتمے کے بعد حسن بن صباح کے

مشہور قلعے التموت میں چلی گئی تھی۔ موجودہ آغا خاں اسی سلسلے کے پیشوا اور اسماعیلی نزاری بوہروں کے امام حاضر ہیں۔

○

شیعوں کا ایک مرنجان مرنج فرقہ زیدیہ ہے جو ہمیشہ سے یمن میں حاوی رہا اور سنہ ۹۳۲ء سے اس فرقے کے امام تقریباً مسلسل یمن پر حکمران چلے آتے ہیں۔ یہ فرقہ حضرت زید بن علی (شہادت سنہ ۷۴۰ء) سے منسوب ہے جن کا قول تھا کہ خلافت، حق تو صرف علی کا تھا مگر انھوں نے خلفائے ثلاثہ کی خلافت منظور کرلی تھی لہذا وہ بھی جائز خلیفہ تھے۔ زیدیہ اسی لئے خلفائے ثلاثہ پر تبرّہ نہیں کرتے، اصول فقہ میں فقہ حنفی اور شافعی کے پیرو ہیں، تقیہ اور متعہ کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ ان کے نظام عقاید پر بھی معتزلہ کے فلسفیانہ تصورات غالب ہیں۔ کسی زمانے میں زیدیہ کی دعوت بھی دور دور پھیلی ہوئی تھی چنانچہ مراکش کے موجودہ شاہی خاندان کا اقتدار بھی دراصل زیدیہ دعوت کے تحت مراکش پر ملا ہے جو نسلاً حضرت حسن بن علی سے تعلق رکھتے ہیں۔

○

ہندوستان میں اثنا عشری فرقہ کو عروج نوابان اودھ کے زمانے میں ہوا جب مجتہد العصر علامہ دلدار علی (وفات سنہ ۱۸۳۰ء) سفر عراق سے واپس آئے نماز جمعہ و امامت قائم کی اور ہندوستان میں شیعی فقہ و حدیث کی باقاعدہ تدریس کا سلسلہ شروع کیا ان کے صاحبزادے مجتہد العصر سید محمد صاحب نے لکھنؤ میں سلطان المدارس قائم کیا جو آج اثنا عشری شیعوں کا سب سے بڑا علمی مرکز ہے۔

○

زہد و اتقا
کا
نظریہ

مذاہب عالم کی تاریخ میں اسلام کو ایک ایسے مذہب کا درجہ حاصل ہے جس نے دین و دنیا کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم قرار دیا اور دنیا سے فرار، لذتوں سے دوری اور انسانی زندگی کی عام لہروں سے علیحدگی کو سختی سے ناپسند کیا، اور ترک دنیا کی جگہ دنیا سنوارنے کو فرض بنایا۔ اسلام نے تجرّد کی مذمّت کی اور مذہب کے لئے ایک تارک الدنیا روحانیت پرست گروہ کی ضرورت نہیں سمجھی اس تاریخی ماحول میں تصوف کی پیدائش اور اس کا پروان چڑھنا بظاہر اسلام کے فطرت سے متصادم ہے۔ کیونکہ اسلام نے فرد کو جماعت کے لئے تربیت دینا اپنا طریقہ رکھا تھا اور وہ فرد کو اپنی ذاتی الجھنوں میں پھنسنے سے روک کر ملت اسلامیہ کے مجموعی خمیر میں ضم کرتا تھا۔ اس میں اس بات کی گنجائش کہاں تھی کہ آدمی کی پوری نفسیات صرف فرد کی خود اپنی اندرونی کائنات کے رنگا رنگ جلووں میں پھنس کے اُسی کی ہو رہے؟

تصوف کی ابتدا سیاسی تصادم اور معاشرتی اُلجھنوں کے زمانے میں ہوئی مگر اس نے فرد کی نفسیات کو سمجھنے، انفرادی مسائل حل کرنے اور ذاتی تسکین کا سامان فراہم کرنے میں کچھ اس درجہ کامیابی حاصل کی کہ اسکے اصول اور طریق کار کو دوام حاصل ہوگیا۔ اور بعد کے زمانوں میں تصوف سے اچھے اور برے دونوں کام لئے گئے اور نفسیات کے عملی علم کی شکل اختیار کر کے اس نے اسلامی تہذیب میں اپنی ایک مستقل جگہ بنالی۔ اس پر جتنی کچھ بھی تنقید کی جاتی ہے اس کی وجہ بعد کے زمانوں میں صوفیوں کے اس رویہ کی وجہ سے کی جاتی ہے جو انھوں نے فلسفہ سے متاثر ہوکر اختیار کیا مابعد الطبیعات اور الٰہیات کے صوفیانہ نظرئے ہمیشہ باہر سے آئے اور علمائے اسلام نے ان کی مذمّت کرنے میں کبھی تامّل سے کام نہیں لیا ورنہ جہاں تک تصوّف کی اصل روح، اس کی تحریک، گرمی اور افادیت کا تعلق ہے ان کا اعتراف برابر کیا گیا ہے۔ تصوف نے عرب ماحول میں جنم لیا تھا جب عباسی حکمرانوں کے تحت ایک طرف تو اسلامی تہذیب کا ہر شعبہ اپنے پورے عروج پر تھا اور دوسری طرف اسلامی تہذیب کے آئیں عربی سانچے کو عباسی حکمرانوں نے توڑ کر تمدن، افکار اور طرز حیات میں غیر عرب عناصر خصوصاً ایرانی تصورات اور یونانی افکار کے پیوند لگانے شروع کردئے تھے۔ اس کی وجہ سے طرز حیات میں وہ تبدیلیاں آرہی تھیں جنھوں نے عام مسلمانوں کی زندگی کو یکسر کھوکھلا کردیا تھا۔ شریعت کی پابندیوں سے دور بھاگنے کا جذبہ عام تھا، باطن کی گہرائی اور عقیدہ کی پختگی کو رسم پرستی سے بدلا جارہا ہے۔ ایسے وقت صوفیوں کی تحریک پورے زاہدانہ شدّت حیات سے کر اُٹھی۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ دنیا اور اسکی دولت، لذتیں، علم، طاقت اور ان سے استفادہ اصل مقصود نہیں ہے۔ دنیا کو اور اسکی لذتوں کو

مسترد کرنا یا ان سے بچنا تو ضروری نہیں اور نہ ممکن ہے لیکن ایک مومن و مسلم کو دنیا میں طرب و نشاط کے سارے بوجھ ایک ذمہ داری کی طرح اُٹھانا چاہیے تاکہ آخرت میں اس دنیا کی زندگی کو آنے والی زندگی کے لئے نشو و نما کا ذریعہ بنایا جاسکے۔

○

عرب صوفیوں کی اس تحریک کی رہنمائی خواجہ حسن بصری (وفات ۷۲۸ء) کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کا زہد و اتقار اور وحدانیت میں ڈوبا ہوا مزاج صوفی تحریک کیلئے روشنی اور قوت، کتاب اللہ اور سنت رسول سے حاصل کرتا تھا۔ یہ نظریہ کہ صرف عالم آخرت میں ہی نہیں بلکہ اس دنیا کی زندگی میں بھی دل و دماغ کی ایک ایک جنبش کو حاضر و ناظر خدائے واحد کا سامنا ہے۔ صوفی تحریک کو آگے بڑھ کر اس مقام پر لائی جہاں سے اس نے اپنے آپ کو اسلامی تہذیب کی اصلاح فرد کی تعمیر اور اسلام کی توسیع و تبلیغ میں اپنا مستقل حصہ مقرر کرلیا۔ خواجہ حسن بصری نے شریعت کی پابندیوں کو ارتقائے نفس اور رُوح کی ترقی کا ذریعہ محسوس کیا اور پابندیٔ شریعت کو انسان کے اندرونی وجود تک پہنچا کے اس کو ظاہر و باطن میں توحید اور معاد کا معلم اور مفسر بنا دیا۔ ایمان اور عمل کا یہ بالغ نظر جائزہ صوفی تحریک کی جان تھا۔

صوفی تحریک کا ابتدائی زمانہ بہت سادہ اور معاشرت میں نفع بخش تھا۔ روحانی مرشدوں سے تربیت پانے کے بعد صوفی تحریک کے کارکن ویرانوں یا آبادی سے دُور خانقاہوں میں بند ہو کے نہیں بیٹھتے تھے۔ بلکہ آبادیوں اور بستیوں کا رُخ کرتے تھے اور صوفی تحریک کے بنیادی اصولوں کی تبلیغ عام فہم انداز اور تشہیر کے تمام ذریعوں سے کرتے تھے۔ بازاروں، گھروں اور مدرسوں میں جا جا کر انھوں نے صوفی تحریک کو

روشناس کیا اور صوفی تحریک کو عوام تک پہونچایا۔ یہ لوگ بغیر سلے اُون کا سادہ لباس پہنے رہتے تھے۔ جس کو صوف (اُون اور اونی کپڑا) کہا جاتا تھا۔ ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ عوام کو چھوٹے چھوٹے قصے، نصیحت آمیز واقعات، دل نشین پیرائے میں سنایا کرتے تھے۔

ان صوفی قصاص (قصہ گو کارکنوں) نے عوام میں بڑی جلدی اپنا اثر پھیلا لیا۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ تصوف صرف عام وعظ و نصیحت تک محدود تھا، اس نے ایک اجتماعی تحریک کی شکل اختیار کرلی تھی اور جگہ جگہ صوفیوں کے ماتحت ایسے مرکز مسجدوں اور الگ مکانوں میں قائم ہو چکے تھے جہاں عبادت کے علاوہ نفسیاتی تربیت کی ترکیبیں عمل میں لائی جاتی تھیں۔ ان میں ذکر و سماع کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ ذکر قرآن شریف کی مختلف آیات، سورتوں اور دعاؤں کو اجتماعی طور پر پڑھنے کا نام تھا جو غور و فکر اور جذباتیت کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ بلند آہنگ سے ذکر کرنے اور اس کو بطور سماع سننے سے صوفی تحریک کارکنوں پر وہ نفسیاتی کیفیت طاری ہوتی تھی جس میں ان کو اپنے وجود کی غرض و غایت کا بڑا کھلا اور گہرا احساس ہوتا تھا۔ یہی وجد و معرفت ہے۔

صوفی تحریک نے تو عوام پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ لیکن علمائے اسلام نے اسکو ایک الگ نیم مذہبی نظام بنتے دیکھ کر اس کی مذمّت کی۔ امام ابن سیرین (وفات ۷۲۹ء) جیسے زاہد، عابد اور عالم شریعت نے صوفی تحریک پر اس کے ابتدائی زمانوں میں اس پر یہ تنقید کردی تھی کہ یہ مسیحی راہبوں کی پیروی میں صوف (اونی کپڑا) پہنتے ہیں۔ حالانکہ ترجیح سنت رسول کے مطابق سوتی کپڑے کو حاصل ہے۔ صوفی تحریک کے لباس پر امام سیرین کی یہ تنقید بڑی صداقت رکھتی ہے۔ اسمیں عیسائی

رہبانیت کے رنگ و بو، ایرانی عقیدۂ نور و ظلمات اور یونانی فلسفہ سے عالم حقیقی و
و عالم امثال کی تفریق چور دروازوں سے داخل ہونے لگی تھی، شروع میں صوفی
تحریک کے رہنما عرب عالم تھے اور وہ شریعت کے شدّت سے پابند، عقاید میں محتاط
اور اسلامی تعلیمات کے معلّم و مفسّر تھے۔ مگر تیسری صدی ہجری میں صوفی تحریک کی
رہنمائی اس طبقہ کے ہاتھوں میں چلی گئی جو اسلام کے اصول و احکام اور ان کے مقاصد
سے اتنا با خبر نہ تھا، جتنا غیر اسلامی مابعد الطبیعات اور الٰہیات کے علم و مسائل
سے آشنا تھا۔ یہ لوگ بغداد، دمشق، بصرہ اور عراق کے دوسرے بڑے شہروں کے
مخلوط النسل باشندے، تاجر یا صنّاع تھے۔ ان کے اثرات نے صوفی تحریک کو
کافی بدلا اور ان تبدیلیوں نے آخر چوتھی صدی ہجری میں علمائے شریعت کو انکی فکری
گمراہیوں پر سخت گرفت کرنے پر مجبور کیا اور منصور حلاج کو کلمات کفر بکنے کے الزام
میں قتل کرنے کا واقعہ پیش آیا جس نے یہ ثابت کر دیا کہ خواجہ حسن بصری، بایزید بسطامی
عثمان ہارونی اور ذوالنون مصری کے زاہدانہ طرز حیات کی جگہ تصوف میں فکر و نظر کی
بڑی کجروی آ چکی ہے اور یہ دن بدن ایک ایسی تحریک بن رہا ہے جس کا مقصد ضمیر
اجتماعی کو زندہ و بیدار کرنا تھا بلکہ اس سے ٹکرّ لینا ہے یہ ایک بہت بڑے خطرے
کی بات تھی۔ صوفی تحریک ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کیلئے اٹھی تھی اور اسکا مقصد
اسلامی تہذیب کی اخلاقی روح کو چونکانا اور جگانا تھا۔ اس پر حملہ اور ہونا نہیں تھا۔
لیکن صوفی تحریک اس مرحلہ پر آ کر تباہ نہیں ہوئی، بلکہ اس نے اجتماعی ضمیر کے
خلاف انتشار پسندی پر خود احتساب کیا اور حضرت رابعہ بصریؒ (وفات ۱۸۵ھ)
جیسی شخصیتوں کا اثر صوفی تحریک پر غالب آ گیا جو اطاعت الٰہی کو انسان کے لئے

واحد نجات کا راستہ سمجھتی تھیں اور بد مزاج صوفیوں کے ترش روئے سے جو اجتماعی ضمیر اور اجتماعی عقاید کو صدمہ پہونچتا تھا بہت بلند تھیں۔ انھوں نے صوفی تحریک کو یاد دلایا کہ صوفیوں کا کام خدا سے عشق رکھنا تو ہے ہی اور اسکے بندوں سے محبت رکھنا بھی ہے۔

○

چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں تصوف ایک توازن تھا اور یہ عام انتشار پسند عناصر سے پاک تھا۔ اسی زمانہ میں اس کے طور طریقے بنے۔ ذکر و سماع کو صوفی تحریک کے نظام میں مرکزیت ملی۔ اس کے لئے پُرزور آہنگ دار نثر اور مترنم بحروں والی نظم میں ادبیات کی تخلیق ہونے لگی۔ جو ذکر و سماع کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ ان میں معانی کے اعتبار سے ایک روحانی اور تصوری کیفیت ہوتی تھی۔ ان کا مقصد ذکر و سماع کی محفلوں میں ذکر کرنے والوں پر ایک روحانی وجدانی کیفیت طاری کرنا تھا جو حواس خمسہ کا راستہ بند کرکے حس مشترک کو بیدار کریں اور وہ ذہنی یکسوئی پیدا ہو جس میں نفس کو حقیقت مطلق کا علم ہو سکے۔ صوفی اس علم کو معرفت کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ روحانی مشاہدہ سے درجہ بدرجہ مقامات طے کرنے کے بعد اس وقت حاصل ہوتا ہے جب سالک کو مرشد روحانی کی رہنمائی حقیقت مطلق کے قریب پہونچا دے۔ صوفی تحریک نے اس معرفت کو فطری طور پر بڑی اہمیت دی۔ ان کی ساری کوششوں کا ماحصل ہی معرفت تھا۔ وہ معرفت کو جو ایک نادر و نایاب ذاتی تجربہ تھی کتابی علم پر ترجیح دیتے تھے۔ لیکن انھوں نے غلطی یہ کی کہ اس معرفت کو جسے حاصل کرنا صرف صوفیوں کا ہی کام تھا بقیہ سارے علوم سے نہ صرف برتر و بلند

بلکہ اس معرفت کو حق و صداقت کی آخری کسوٹی سمجھنے لگے۔ ان صوفیوں نے عوام میں آکے یہ دعویٰ کیا کہ ہم ہی اسلام کے اکیلے سمجھنے والے ہیں۔ جن علمائے کتاب و سنت، فقہ عقائد اور شریعت کو باقاعدہ سماجی علوم کی طرح حاصل کیا تھا ان کو صوفیوں نے اپنے جارحانہ رویے سے بڑا پریشان کیا۔ اس بات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ صوفی تحریک کو ابھی تک کوئی کامل رہنما نہیں ملا تھا جو اس کے ادھر اُدھر بھٹکنے کا راستہ بند کر دیتا اور اس کو ایک مستقل جگہ دے کے اسلامی تہذیب میں اس کا صحیح مقام متعین کرتا۔

صوفی تحریک کے ان غیر اسلامی عناصر کے خلاف آخر ایک زبردست لہر اٹھی۔ اور سب سے پہلے امام قشیری (وفات ۱۰۷۲ء) نے جو عالم دین اور والا مرتبت صوفی بھی تھے، 'رسالہ قشیریہ' لکھ کر صوفی تحریک کو اسلامی تہذیب کے مزاج و ضمیر سے قریب کیا۔ انھوں نے اس علم کی اہمیت کم نہیں کی۔ لیکن انھوں نے اس بات کی حمایت کی کہ ہر مسلمان کو کوشش کرنا چاہیئے کہ وہ معرفت کے درجہ پر پہونچے جو روحانی ارتقا کا ایک بلند مقام ہے اور جہاں سے حقیقت مطلق کا یقین ایمان بالغیب کی جگہ مشاہدہ و تجربہ سے جنم لینے والا عین الیقین بن جاتا ہے۔ صوفی تحریک میں گمراہ فرقوں نے غیر اسلامی فلسفے اور اعمال کی جو آمیزش کی گو اس کے خلاف امام شمس الدین ابوالفرح ابن جوزی (وفات ۱۲۰۱ء) نے "تلبیس الابلیس" لکھ کے جہاد کیا مگر صوفی تحریک کی کامل اصلاح اور رہنمائی امام غزالی (وفات ۱۱۱۱ء) کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی ہے انھوں نے اپنے انقلابی شخصیت اور فطانت سے علمائے اسلام اور صوفیوں کو دونوں اپنی طرف کھینچا۔ ان کے باہمی اختلافات دور کرے۔

تصوّف کو علمی حلقوں کے لئے قابل قبول بنایا اور تصوّف کی ایسی تعبیر و تفسیر کی کہ وہ عام ذہنوں کے لئے کوئی معمّہ نہ رہا بلکہ ایک سیدھی سادی حقیقت بن گیا۔

امام غزالی نے ویسا ہی کام کیا تھا جیسا کہ امام اشعری نے فرقہ معتزلہ کے خلاف کیا تھا۔ دونوں کا کارنامہ، مقصد، اور طریقہ کار بھی ایک جیسا ہے۔ امام اشعری نے ایک فلسفی کے ذہن سے کام لیا تھا اور فلسفہ کے حملہ سے بچانے کے لئے دینیات کو منطقی بنیادوں پر ترتیب دیا تھا۔ امام غزالی نے بھی یہی کیا۔ انھوں نے ایک عالم دین کی شخصیت میں محدود و مقیّد ہو کے تصوّف کو صوفی تحریک سمیت اسلام اور ملّت اسلامیہ کے سامنے ایک نئے نظام کی شکل میں رکھا۔ یہ ایک ایسا نظام تھا جس کی مخالفت کسی گوشہ سے نہیں ہوئی۔ اور "صوفی تحریک" امام غزالی کی فکری رہنمائی میں علمائے اسلام کے اجماع سے اسلامی تہذیب کے رگ و ریشہ میں پیوست ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوفی تحریک نے اجتماعی مقاصد کو پورا کرنے میں بڑا زبردست حصّہ لیا۔ اس کی تعمیری جدوجہد میں سب سے نمایاں بات اسلام کی زبردست تبلیغ ہے۔

○

صوفی تحریک نے اسلامی تہذیب میں انفرادی سیرت اور کردار کی اہمیت ہی کو نمایاں نہیں کیا بلکہ اسلام کو ان دور دراز علاقوں تک پہونچایا جہاں اسلامی مملکت کی حدیں نہیں پہونچی تھیں۔ چنانچہ یہ صوفی تحریک تھی جس نے ترکی، بلقان، وسط ایشیا، انڈونیشیا، افریقہ اور ہندوستان میں لشکروں سے پہلے اسلامی تہذیب کا ہراول دستہ بن کر بیشمار انسانوں کو مسلمان بنایا۔ اور ان کی تہذیب کو اس طرح متاثر کیا کہ وہ اسلامی تہذیب کا ایک حصّہ بن گئے۔ صوفی تحریک نے ان نئے مسلمانوں کی ادبیات کو بڑی

شدت سے متاثر کیا۔ اور توحید و معاد کے حقائق سے آشنا ادب پیدا کیا۔ مقامی زبانوں میں لکھنے پڑھنے اور ان کو تبلیغ و تحریر کا ذریعہ بنانے سے صوفی تحریک نے خود بھی کامیابی حاصل کی اور اسلامی تہذیب کو بھی نئی فتوحات سے مالا مال کیا۔ نیا قالب لے کے صوفی تحریک نے پختگی کی منزل میں قدم رکھا۔ اب تک صوفی تحریک میں نظریے کے بڑے گہرے اختلافات تھے اس میں وہ ذہین لوگ بھی تھے جن کے لئے تصوف ایک زبردست روحانی تجربہ کی حیثیت رکھتا تھا جس سے وہ حقائق اسلام کو زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھ سکتے تھے، اور ایسے لوگ بھی تھے جو ذہنی اعتبار سے پست و پسماندہ تھے۔ ان کو تصوف میں جذباتی تسکین تو مل جاتی تھی لیکن روحانیت اور اخلاق کا کوئی سبق نہیں ملتا تھا، اور اُلٹے ان کے دل و دماغ پر اخلاق اور روحانیت کی مزاحمت اور شریعت کی مخالفت کے جذبے طاری تھے۔ اس فرق کو امام غزالی کے تجدیدی کارنامے نے ختم کر دیا۔ تصوف کا پورا ڈھانچہ بن گیا اور یہ ڈھانچہ پختہ اور مضبوط ہو گیا۔ انتشار پسندی کی جگہ اس میں مرکزیت آگئی۔

ایک شعبہ علم بن جانے کے بعد تصوف کے بارے میں تصنیف و تالیف پر توجہ ہونے لگی۔ عرب اسلامی تہذیب کے زمانے میں ان کتابوں کا مرکزی موضوع وہی تھا جو اسلامی تصوف کا مقصد: تعمیر شخصیت ہے۔ ان کتابوں میں نامور صوفی، بشر حانی (وفات ۸۴۱ء) کی کتاب فی تصوف، ابوطالب مکی (وفات ۹۹۶ء) کی قوۃ القلوب اہمیت رکھتی ہیں۔ آگے چل کے جب تصوف کے فکری مواد میں فلسفہ اور الٰہیات کے مسائل بھی داخل ہو گئے تو صوفیانہ ادبیات میں بڑا اضافہ ہوا اور یہ فلسفہ آمیز کتابیں اسلامی دنیا میں پھیل گئیں کیونکہ ان کو

درس گاہوں کے نصاب میں داخل کرلیا گیا تھا۔ امام غزالی کے سات رسالے: اربعین انکی دو مشہور کتابیں: احیاء علوم الدین اور کیمیائے سعادت تقریباً نصابی مجموعے ہوگئے۔ شہاب الدین سہروردی (قتل سنہ ۱۲۳۴ء) کی عوارف المعارف اور محی الدین ابن العربی (وفات سنہ ۱۲۴۰ء) کی فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ بہت مقبول ہوئیں۔

صوفی تحریک کے حالات پر بھی تحریری مواد جمع ہونے لگا۔ محمد بن اسحاق (وفات سنہ ۱۰۰۰ء) نے تعریف اہل مذاہب تصوف میں صوفی سلسلوں اور انکی اصطلاحات پر ابتدائی معلومات اکٹھا کیں۔ سربرآوردہ صوفیوں کے حالات پر ابوعبدالرحمان سلامی (وفات سنہ ۱۰۲۱ء) نے طبقات الصوفیا، ابونعیم اصفہانی (وفات سنہ ۱۰۳۸ء) نے حیات الاولیا مرتب کیں۔ صوفیانہ سوانح و تذکرے کی بہت سی کتابیں ہر دور میں لکھی جاتی رہی ہیں۔ ہندوستان میں فریدالدین عطار (وفات سنہ ۱۲۳۰ء) کی تذکرۃ الاولیا اور شہزادہ داراشکوہ (قتل سنہ ۱۶۵۹ء) کی سفینۃ الاولیا نے شہرت اور مقبولیت پائی۔

○

صوفی تحریک

تصوف کو امام غزالی نے سیدھے راستے پر لا کھڑا کیا تھا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے صوفیوں اور علمائے اسلام دونوں کے درمیان اپنی تحریروں سے ایک مستقل رابطہ کر دیا بلکہ یہ ہے کہ وہ تصوف کے لئے اسلامی تہذیب کے وہ پختہ، معروف اور ذہنوں پر حاوی دلائل کو ڈھونڈھ لائے جو نصابی فلسفے، منطق، دینیات کا سرمایہ تھے۔ امام غزالی نے علمی مرکزوں کے ذہنی سرمایے کو اُٹھا کے تصوف کے حوالے کر دیا اُس کے کشف و وجدان کے خزانوں کو معقولات اور منقولات کی نئی دولت سے بھر کے غزالی نے تصوف کو اسلامی تہذیب کے عام مزاج سے ہم آہنگ بنانے کا آغاز کیا اور اس زور، ایسی شان سے کیا کہ تصوف اسلامی تہذیب کے دوسرے اجزا سے ترکیب کھا کے ان میں پیوست ہو گیا اس میں شک نہیں کہ اس عمل سے اسلامی تہذیب کو بڑے فائدے بھی پہونچے تھے۔ سب سے پہلا فائدہ صوفی تحریک نے خود احتسابی اور انفرادی اصلاح و تعمیر پر زور دے کے پہونچایا۔ شریعت پر ظاہری عمل

کے ہمراہ اسکو دل کی گہرائی میں یقین و اخلاص سے تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرکے گہری روحانی مسرت حاصل کرنے کو صوفی تحریک نے ضروری بنادیا۔ مرکز سے وابستگی کے لئے یہ تعلیم بڑی مفید ثابت ہوئی۔ اس نے اسلامی ممالک میں مقامی مزاج و ماحول کو غیر شعوری طور پر توڑ کے ان مقامی تنگیوں کی جگہ عالمگیر وسعت و حدت پیدا کی اور مسلم معاشرے میں فکر و نظر کی پختگی لانے کا فرض ادا کیا۔

تمدّنی ارتقار کی بنا پر مسلم ملکوں میں بے شمار علمی مرکز قائم ہو چکے تھے۔ ان کے ذریعے اسلامی اصول و عقاید و قانون کی تعلیم پھیل رہی تھی۔ صوفی تحریک ان علمی گروں کے پہلو بہ پہلو پھلی پھولی۔ اس نے آبادی کے عام حصّوں کو اپنا مقصد بنایا جہاں علم و فضل کی روشنی نہیں پہونچتی تھی اور اس آبادی کو اپنی تعلیم، اپنی عملی زندگی اور جدوجہد سے پاک و صاف کرنے اور اس کی ذہنی اور عملی زندگی کی سطح بلند کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ صوفی تحریک نے خود احتسابی و تعمیر سیرت کے لئے عملی نفسیات کے علم سے کام لیکر ایک طریقہ بنالیا تھا۔ بڑے بڑے صوفی رہنماؤں کی نگرانی میں انکے معتقد اور مرید اس طریقہ سے اپنے نفس کا مشاہدہ کرتے اور اسکو پاک و صاف بناتے تھے طریقہ یہ تھا کہ مرشد کے روحانی اثر کی رہنمائی میں یہ مرید و معتقد کشف و مراقبہ کرتے تھے جسکو کئی مرحلوں: مقامات میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہر مقام پر نفس کو نئے مشاہدوں اور فکر و نظر سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ مرشد روحانی کی موجودگی میں یہ سارے مرحلے: مقامات طے کرنے کے بعد نفس کو پاکیزگی، ایمان، اخلاص اور یقین و عمل کی دولت مل جاتی تھی جسکو صوفی تحریک میں مقام فنا کا نام دیا گیا تھا۔ مقام فنا پر پہنچ کے صوفی کے لئے کائنات کی ہر شے نابود ہو جاتی تھی۔ صرف اللہ واحد کی ذات مطلق اسکے

سامنے ہمہ وقت ہوتی تھی اور اس کی ساری زندگی اس مشاہدے و شہود کے عالم میں یوں بسر ہونے لگتی کہ مادی تعلقات سے رشتہ کٹ جاتا اور مقصد حیات اللہ واحد کی پرستش و اطاعت کو اپنی زندگی کی طرح دوسروں کے لئے ضروری اور یقینی بنانا ہو جاتا۔ یوں صوفی تحریک کے افراد اسلامی تہذیب میں توحید کے عملی پیامبر بن گئے تھے کیونکہ وہ مقام فنا پر پہونچ جانے کے بعد اپنے انفرادی عروج کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنی زندگی کو توحید کی اشاعت میں وقف کر دیتے تھے۔ یہی تصوف کا مقصد بھی تھا کہ ہر انسان ایک عبد (بندے) کی حیثیت میں معبود کے حق پوری طرح ادا کرے اور حق کی ادائیگی اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے کہ عبد (بندہ) خود بھی پورا عبد (بندہ) بن جائے اور دوسروں کو بھی پورا عبد (بندہ، غلام، تابع دار) بنا دے!

صوفی تحریک کا یہ پہلو اسکو انفرادیت پرست نہیں بلکہ اجتماعیت پسند بناتا تھا۔ لیکن اس پر بار بار انفرادیت پرستی حملہ کر کے اسکو زندگی سے فرار سکھاتی رہی اسکی سب سے بڑی وجہ صوفی تحریک میں ان عناصر کا گھس جانا ہے جن کا مقصد سیاسی تھا۔ اسکی سب سے بڑی مثال زمانہ وسطیٰ میں رسایل اخوان الصفا (ترتیب ۹۳۰ء) سے ملتی ہے۔ انکو اسماعیلی فرقے کے چند عالموں نے ترتیب دیا تھا۔ زبان و بیان کے لحاظ سے یہ صوفی تصورات کی نمایندگی کرتے ہیں لیکن ان کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ انسانوں کے لئے ملکوت آسمانی (ایک مسیحی اصطلاح) تک پہنچنا ضروری تو ہے مگر وہ اس آسمانی بادشاہت تک صرف اس راستے سے پہونچ سکتا ہے جو خدا نے خاص طور پر کھولا ہے۔ شریعت نہیں بلکہ طریقت اس راستے کی رہنما ہے عقاید و

وقانون کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کے لئے انکے اسرار و رموز سے واقف ہونا ضروری ہے اور یہ رموز و اسرار قرآن و حدیث کے ذریعے نہیں کھل سکتے، کیونکہ قرآن و حدیث کے الفاظ کے ظاہری معنوں کے علاوہ انکے ایک باطنی معانی ہیں ان سے واقف ہونے کے بعد وہ خاص راستہ کھلتا ہے جو خدا نے مقرر کر دیا ہے اور وہی راستہ ملکوت آسمانی (آسمانی بادشاہت: عیسائی راہبوں اور پادریوں کی مشہور اصطلاح) کیطرف انسان کو لے جا سکتا ہے۔

رسایل اخوان الصفا میں نو افلاطونی فلسفے کے بہت سے نظریات خامکارانہ انداز اور ادبی زبان میں پیش کئے گئے۔ اس کا مقصد صرف ایک تھا: باطن کی واقفیت کے لئے ایک پُر اسرار، غائب از نظر، خفیہ و پوشیدہ روحانی مرشد کی تلاش کو ضروری بیان کر کے اسکی ذات کی تلاش کا جذبہ پیدا کرنا۔ اسکے بعد آدمی کو خود اسماعیلی تحریک کے کارکن اپنے حلقے میں گھسیٹ لاتے تھے اور اس سے ایک صاحب اسرار امام کی اطاعت کا حلف لے لیتے تھے۔ یہ ایک خالص سیاسی چال تھی اور اس کا مقصد اسماعیلی تحریک کے لئے نئے حامی فراہم کرنا تھا۔ تصوف کی مقبولیت کو دیکھ کے انھوں نے صوفی تحریک میں بھی گھس جانا چاہا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے میں تصوّف پر اسماعیلی باطنیت اور شیعہ نظریات کا اثر نظر آتا ہے۔ یہ رسائل اخوان الصفا کی اشاعت کے بعد صوفی تحریک میں اسماعیلی کارکنوں کے گھسنے اور اسکو اپنے مطلب کی تحریک بنانے کی جدوجہد کی نتیجہ ہے۔

رسائل اخوان الصفا کے بعد اندلوسی فلسفی و متفکّر محی الدین ابن عربی (وفات ۲۴۰ھ دمشق میں) نے بھی صوفی تحریک کے قالب میں نو افلاطونی فلسفے کو داخل

کیا۔ وہ غیر سیاسی آدمی تھے مگر اندلوسیہ کی فضا میں پلے تھے جہاں فلسفے اور منطق سے ذوق عام تھا۔ زہد و اتقا میں وہ بے مثل تھے۔ روحانی مرحلوں کے لاتعداد تجربے انھوں نے کئے اور اپنے روحانی تجربات کو بیان کرنے کی کوشش کی، انکی دو کتابیں نصوص الحکم اور فتوحات مکیہ، تخیل، اسلوب اور زبان کے اعتبار سے حیرت انگیز اثر رکھتی ہیں۔ ان میں فلسفے کی گہرائی اور شعریت ہے، تخیل و فکر کی بلند پروازی ہے اور یہ حسین و جمیل نثر میں شدت و حرارت سے مملو جذبات کی عکاس ہیں۔ ابن عربی نے اسلام کی تعلیمات و عقاید کی صوفیانہ تعبیر کی اور قران مجید کی تفسیر بھی لکھ ڈالی۔ جس میں نو افلاطونی فلسفہ کا دریا بہتا نظر آیا ہے۔ وہ صوفی کم تھے۔ بڑے فلسفی اور ادیب زیادہ تھے لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں ہوسکتا۔ بہرحال انھوں نے صوفی تحریک میں زلزلہ پیدا کردیا۔

ابن عربی کی تاثیر نے صوفی تحریک سے رسائل اخوان الصفا کے فلسفیانہ رعب و اثر کا خاتمہ کردیا۔ زبان و بیان کے اعتبار سے رسائل انکی کتابوں کے آگے ہیچ ہے اور تخیل و تصور میں ڈوبے ہوئے فلسفے کو ابن عربی نے شعر و ادب کا درجہ دے کے رسایل کے باطنی نظریے پر حاوی کردیا۔ رسائل اخوان الصفا لوگوں کو ایک بلند روحانی ہستی کی سمت بُلاتے تھے، ابن عربی نے ہر فرد کے لئے یہ بلندیاں عام کردیں۔ رسائل نے کشف و مراقبے، مقامات و سلوک، زہد و ریاضت کو بیکار قرار دیا تھا تاوقتیکہ ان کی باطنی اہمیت و اصلیت نہ معلوم کرلی جائے لیکن ابن عربی نے ان سب اعمال و افعال کو قابل حصول قرار دیا اور ان پر اس شدت سے زور دیا کہ یہ صوفی تحریک کے لئے ضروری بھی بن گئے اور ابن عربی کے فلسفے کے مطابق ہر ایک

فرد کے لئے، کسی توسط و واسطے کے بغیر، آسان و ممکن بھی نظر آنے لگے۔

ابن عربی نے حقائق تک پہنچنے کے لئے پہلی بار زبان کو استعمال کیا اور مجاز و استعارے سے کام لے کے ان جذبات و حسیات کی ترجمانی کی جو صوفی کے دل میں موجزن رہتے ہیں۔ انھوں نے ہدایت و رہنمائی کی طلب کو کمتر بنا کے صوفی تحریک کو ایک نیا نظریہ دیا: یہ نظریہ عشق ہے جو یہ کہتا ہے کہ:

مقام فنا کا مل جانا خود احتسابی و عملی ریاضت کے طویل و پُر پیچ مرحلوں پر منحصر نہیں نہ اس کے حصول کے لئے کسی بلند و برتر ہستی کی تعلیم درکار ہے بلکہ مقام فنا، قلب کی گرمی اور طلب کی شدّت سے ملتا ہے۔ جو اپنے آپ کو عشق الہٰی میں جلا کے راکھ بنا دے گا اس کا وجود مٹ جائے گا اور جس کا وجود مٹا وہ قطرہ کی طرح سمندر میں جذب ہو گیا۔ جب کچھ نہیں رہیگا تو صرف وہی رہ جائے گا جو، ہمیشہ سے تھا، ہے اور رہے گا۔

ابن عربی نے وحدت الوجود سے صوفی تحریک کو آشنا کر کے ایک تاریخی موڑ پیدا کیا اور اسکے بعد وحدت الوجود کا نظریہ ہر زمانے میں صوفی تحریک کی نظریاتی بنیاد اور اس کا عقیدہ لازم بنا رہا۔

ابن عربی نے تصوف کو روحانی ارتقا کا جو نیا فلسفہ بخشا تھا اسکی تکمیل ان کے سب سے بڑے شارح اور ذہنی پیرو عبدالکریم الجیلی (وفات ۱۴۱۷ء) نے اپنے شعر و نثر سے کردی اور خصوصیت سے اپنی کتاب "الانسان الکامل" میں اس نے تصوف کے نظری مواد کو ارتقا کے جدید ترین حیاتیاتی نظریے کے قریب لا کھڑا کیا۔ الجیلی

نے عالم خارجی کو تصور محض قرار دیا، واجب الوجود کو مرکز و محور تسلیم کیا اور انسان کے لئے درجہ بدرجہ ترقی کرنے اور آخر کامل ہونے کی منزل ممکن مان لی۔ الجیلی کا یہ نظریہ ارتقا مسلمانوں کے لئے نئی چیز نہ تھا وہ اُندلس کے فلسفیوں کے رجحان سے واقف تھے کہ کائنات میں تخلیق کا عمل تدریجی ہوا ہے اور برابر ہو رہا ہے اسی چیز کو مشہور فلسفی محمد ابن یعقوب ابن مسکویہ (وفات ۱۰۳۰ء) نے اپنی تصنیف فوز الاصغر میں پیش کیا تھا۔ اسی ذہنی پس منظر اور علمی حمایت کی وجہ سے تصوف کے میدان میں ابن عربی اور انکے شارح عبدالکریم جیلی کے اثرات رسایل اخوان الصفا کی مجہول و محتاج ذہنیت کو ہٹا کے چھا گئے۔

ان اثرات نے انسان کے شخصی انا، اسکی قوت اور اسکے عزم، اسکی آرزو اور اسکے مقاصد سب کو بدل دیا، فکر و نظر میں اعتماد اور بلندی پیدا کی۔ یہ احساس رفعت صوفی ادبیات میں مرکزی نکتہ ہے اسی احساس کی وجہ سے صوفی کے لئے اپنی ذات اسکے تجربے، اسکی کیفیت اور اس پر گزرنے والی کلفت یا اسے ملنے والی مسرتیں بڑی گراں مایہ باتوں کا رتبہ اختیار کر لیتی ہیں۔ رُومی کی گرمی، حافظ کا سوز و گداز اسی احساسِ ذات کا نتیجہ تھا۔ اردو میں میر دردؔ جیسے قدیم شاعر اور اقبال جیسے جدید شاعر نے خودی اور اسکے مظاہر و مراحل پر اسی لئے زور دیا ہے کہ ابن عربی اور عبدالکریم جیلی نے انسان کامل کو کم از کم اسکے وجود ذہنی تک پیدا کر دیا تھا۔

مارکسی نقّادوں نے تصوف کو ترقّی پسند تحریک کہا ہے اس کی وجہ بھی ابن عربی اور ان کے شارح عبدالکریم الجیلی کے انسان کامل والے نظریات ہیں جو ان نقادوں کو تصوّف میں نظر آئے تھے لیکن یوں یہ نقّاد تصوف کے تاریخی کردار سے ناواقف

ہی ہیں۔

○

صوفی تحریک نے ترقی کر کے ایک وسیع تربیتی نظام کی شکل بھی اختیار کر لی پاکباز اور صاحب دل مرشد کے اردگرد پہلے جو حلقۂ اخلاص ڈھیلا ڈھالا سا قائم ہوتا تھا۔ اس کو روحانی شیخ و مرشد کی بلند شخصیت کے بلند تصور نے نئی شکل دے دی۔ اب درویشوں کے حلقۂ عقیدت کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے مرشد سے قربت حاصل کرنے کے لئے نہ صرف بیعت کریں بلکہ شیخ یا پیر سے روحانی فیض لینے اور ان کی ذات سے سیکھنے سکھانے کے لئے شیخ کے ساتھ ساتھ ایک طویل عرصہ بسر کریں۔ اس طرح خانقاہی طرز صوفی تحریک نے سیکھ کے عملی ترتیب کا وہ طریقہ رائج کیا جو بڑی حد تک اجتماعی تھا۔ خانقاہی تربیت بڑی اچھی چیز ثابت ہوئی۔ یہاں صرف روحانی مدارج ہی طے کرنا نہیں ضروری ہوتا تھا بلکہ مریدوں کو شیخ کے سیرت و کردار کی خوبیاں دیکھنے اور ان کو اپنانے کا بھی موقع ملتا تھا۔ خانقاہوں میں نظری تعلیم کے لئے کافی اہتمام کیا جاتا تھا۔ شیخ کے وعظ و نصیحت، تربیت و تادیب کے ساتھ ساتھ صوفی تحریک اور اس کے نظری و عملی مسائل پر شیخ کی زبان سے برابر گفتگوئیں سننے سے مریدوں کا ذہن بھکنے نہیں پاتا تھا۔ اور وہ ان گمراہ صوفیوں کے فریب سے محفوظ ہو جاتے تھے جو ایک طرف جاہل تھے اور دوسری عقیدتوں کی آڑ میں بے لگامی، دنیا پرستی اور لذت پسندی کو اصل آزادی و معرفت قرار دیتے تھے۔ خانقاہ کی ہمہ وقتی تربیت نے فکر و نظر کے اعتبار سے سلجھے ہوئے اور صوفی تحریک کے نظری و عملی مسائل سے اچھی طرح واقف کارکنوں کی بڑی تعداد مہیا کر دی۔ خانقاہ ایک ایسا مرکز بن گئی جہاں عام

مسلمانوں اور بادشاہوں دونوں نے عقیدت کے پھول لاکر نذر کئے تھے۔ انکو عوام کی نذر و ہدیہ سے اور بادشاہوں کی معافی اور جاگیروں سے بڑی آمدنی ہونے لگی۔ اور ان خانقاہوں سے جو کارکن تربیت پاکے نکلے انھوں نے اپنے اپنے مرشد سے طریقۂ تصوف کے مطابق کام کیا۔ یہ ہر طرف پھیل گئے، دور دور تک پہونچے اور جہاں جہاں بس گئے وہاں خود انھوں نے ایسے خانقاہی مرکز قائم کئے جہاں ان کے سلسلہ کے طریقے کے مطابق صوفیانہ اعمال، ریاضت اور عبادت کی جاتی تھی۔ ان ذیلی مرکزوں کا تعلق اپنے ابتدائی اور بڑے مرکز سے ہمیشہ قائم رہتا تھا اور مرکز کا سجادہ نشین ان ذیلی مرکزوں کا رہنما اور مرشد ہوا کرتا تھا۔ بارہویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں خانقاہوں نے مسلم ممالک میں ہر جگہ ایک جال سا پھیلا دیا۔ ان کا مقصد اپنے اپنے طریقے کے مطابق صوفیانہ طرز کی تعلیم و تربیت آگے کو بڑھانا تھا۔ ان کے لاکھوں کروڑوں معتقد تھے۔ صوفیوں کے یہ سلسلے باہمی اختلاف بھی رکھتے تھے۔ کوئی سماع سنتا تھا کوئی اسے حرام جانتا تھا۔ کسی کے پاس وحدت الوجود کا زور تھا تو کوئی وحدت الوجود کی تاویل کرتا تھا۔ البتہ ذکر کا رواج ہر طریقہ میں ہمیشہ موجود تھا۔ اور موجود رہا۔ ذکر کا مقصد خدا کی طرف متوجہ کرنا ہے اور اس کے مختلف طریقے ممکن ہیں۔

ان سلسلوں میں روحانی اعمال تربیت اور نظرئے کا فرق ضرور ہے اور کہیں کہیں یہ بہت زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسکی وجہ وہی قدیم کشمکش ہے جو تصوف کے اندر غیر اسلامی عناصر اور امام غزالی کی فکر کے درمیان اب بھی جاری ہے۔ مستند سلسلے تو طریقت کو شریعت سے الگ نہیں کرتے بلکہ تصوف کو ایک علمی نصاب کی حیثیت دے کر اسکے ذریعہ اطاعت الٰہی کا وہ جذبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جو شریعت کے

نظام کا آخری مقصد ہے۔ یہ سلسلے اسلام کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان میں عقیدے یا عمل کی کسی خرابی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ ان میں ایک طرف شریعت کے ظاہری قوانین و احکام کی پوری پابندی کی جاتی ہے۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو معرفت اور روحانیت کی جستجو اور حصول ان سلسلوں کا مقصد ہے۔ ان میں سب سے پہلے تو حضرت شیخ سیدنا عبدالقادر جیلانی (عمر سنہ ۱۰۷۵ء سے تا سنہ ۱۱۶۶ء) کے نام نامی سے نسبت رکھنے والا سلسلۂ قادریہ ہے۔ آپ عربی لسانیات اور ادب کے غیر معمولی عالم اور حنبلی فقہ کے بڑے فقیہہ تھے۔ بغداد میں ایک معلّم اور عالم کی حیثیت سے زندگی بسر کی۔ دلوں کو موہ لینے والے انداز میں وعظ و نصیحت کرتے اور تعلیم و تربیت سے لوگوں کو صحیح راستہ پر لگاتے تھے۔ اہل بغداد نے آپ کی ان عظمتوں کو یوں خراج تحسین پیش کیا کہ بغداد قدیم کے دروازے کے باہر آپ کے لئے ایک وسیع رباط (خانقاہ) تعمیر کر دی۔ جہاں عرصہ دراز تک آپ عوام و خواص کے تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق میں لگے رہے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے اور مرید سلسلۂ قادریہ کے طریقے و تعلیمات کو لے کر دنیا میں پھیل گئے۔ چھ صدیوں سے سلسلۂ قادریہ کے رباط، خانقاہیں اور چھوٹے بڑے مرکز انڈونیشیا سے لے کر ہندوستان، افغانستان عراق، فلسطین، مصر، طرابلس، تیونس، الجزائر اور مراکش تک موجود ہیں اور اب بھی بغداد میں آپ کا مقبرہ و خانقاہ پر ہر سال ان تمام ملکوں کے عقیدت مند فاتحہ پڑھنے آتے ہیں۔ چھ صدیوں سے آپ کی براہ راست نسل سے سید نقیب الاشراف مقرر ہوتے ہیں جو سلسلۂ قادریہ کے سب سے بڑے مرشد، ہادی اور رہنما کا درجہ رکھتے ہیں۔ سلسلۂ قادریہ میں اس کے محترم بانی کی شخصیت جھلکتی ہے۔ اس کے افراد کو سخاوت،

ہمدردی، نیک نفسی اور انکساری کی تربیت ملتی ہے اور ان کو سیاسی یا مذہبی نوعیت کی تشدد پسندی سے بلند رکھا جاتا ہے۔ سلسلۂ قادریہ کے شرائط سخت ہیں۔ زہد و اتقا اور دینداری پر زور دیا جاتا ہے۔ ریاضتوں و اعمال کے لئے مخصوص ذکر ہیں جن کو بڑی شدّت سے روزانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن سلسلۂ قادریہ اپنی سادگی اور پرکاری میں جواب نہیں رکھتا کہ نہ تو اس میں نظریاتی اُلجھنیں ہیں نہ کسی قسم کی عملی کجروی کا پتہ ملتا ہے۔

سلسلۂ قادریہ میں کئی ذیلی شاخیں ہیں جو ریاضت و اعمال کی شدت اور نفس کشی کے سخت تر ترکیبوں کے لئے شہرت رکھتی ہیں۔ شیخ احمد الرفاعی (وفات ۱۱۸۲ء) نے عراق میں سلسلۂ قادریہ میں مجاہدات کے اضافے کے ساتھ سلسلۂ رفاعیہ قائم کیا جس کے اندر تربیت نفس کی خاطر جسمانی عقوبت و عذاب برداشت کرنے کی تعلیم ہے۔ سلسلۂ رفاعیہ کے ایک رہنما احمد بضیاوی مصری (وفات ۱۲۷۶ء) نے سلسلۂ بضیاویہ قائم کیا۔ وہ بڑے زبردست مجاہد تھے اور ان کے زمانہ پر جب مصر پر فرنگی پرستان صلیب نے حملہ کیا تو انھوں نے اپنے درویشوں کے ذریعہ تمام مصر میں دعوت جہاد پھیلا دی اور خود بھی بہ نفس نفیس جہاد میں شرکت کی تھی۔ سلسلۂ بضیاویہ اسی لئے نیم فوجی رنگ ڈھنگ رکھتا ہے۔ دریائے نیل کے دہانے کے علاقہ میں قصبۂ طنطہ میں شیخ بضیاوی کے مزار پر سالانہ عرس ہوتا ہے۔ اس میں قدیم جنگی فنون کی چالیں اور ہتھیاروں کے کرتبوں کے مظاہرے پیش کئے جاتے ہیں۔ مصر میں بضیاویہ کی دو شاخیں بیومی سلسلہ اور دصوقی سلسلہ بھی مقبول ہیں۔

سیدنا جیلانی کا سلسلۂ قادریہ عراق، افغانستان، ہند و پاکستان، ملایا انڈونیشیا

تک پھیلا ہوا ہے اور مصر و سوڈان میں بھی اسکے کثیر حلقے پائے جاتے ہیں ہندوستان میں سید محمد غوث گوالیاری (وفات ۱۵۶۳ء) اس سلسلے کے جاری کرنیوالے بزرگ ہیں۔

○

افریقہ کے شمال مشرقی کنارے پر مراکش سے طرابلس تک صوفی سلسلے ایک خاص مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بربر اور نیم عرب قبائل ان علاقوں میں اپنی سادگی، عقیدے کے خلوص اور روایت پرستی کی بنا پر بزرگان دین کا نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ ان کا خیال ہے کہ ان میں برکت (ایک پُراسرار روحانی قوت) ہوتی ہے جس سے وہ غیر انسانی کارنامے کیا کرتے ہیں۔ وہ رباط کے، جو ان علاقوں میں بکثرت ہیں ہر ایک مربوط (رباط نشیں) کو اپنا کامل رہنما، طبیب، قاضی اور مختار تسلیم کرتے ہیں۔ ان رباط نشیں صوفیوں کی حالت یہاں کچھ اچھی نہیں۔ وہ سیدھے سادے کم پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں جو تصوف سے زیادہ واقف نہیں ہوتے۔ لیکن انھوں نے چار صدیوں سے اپنے لاتعداد رباطوں کو نیم مذہبی مرکز بنا رکھا ہے۔ یہیں سے رباط نشیں بزرگوں نے مراکش، تیونس اور الجزائر کے مسلمانوں کو باری باری اسپین، فرانس اور اٹلی کے سامراجیوں سے لڑنے بھیجا اور سب سے بیش قیمت مجاہدے: الجہاد فی سبیل اللہ کی بھٹی میں تپا کے مسلمانوں مغرب الاقصیٰ کو کھرا کندن بنا دیا۔ عہد جدید میں کہیں مسلمانوں نے خلوص اور ایمان کا ایسا اظہار ہتھیاروں میں بھاری پڑنے والے دشمن کے سامنے نہیں کیا، اور نہ کہیں مسلمانوں کی مذہبی قیادت کرنے والے طبقہ نے کسی جگہ عملی زندگی میں ایسی عظیم المرتبت قربانی دی ہے اسکی کچھ مشابہت ہے تو ہندوستان کی اس تحریک حریت کو ہے جسے سید احمد بریلوی اور ان کے مجاہد رفیقوں نے اپنے بعد یادگار چھوڑا۔ ان رباط

نشیں صوفیوں نے سیلاب فرنگ کے سامنے لوہے کی دیوار بن کر کھڑے ہونے کے
علاوہ افریقہ کے وسط اور جنوب میں خانہ بدوش حبشی قبیلوں کو برابر تبلیغ اور تنظیم
کے ذریعہ آغوش اسلام میں لیا۔ ان حبشی قبیلوں کے مذہبی عقائد اعلوفا کہلاتے ہیں
جن کی ہدایت میں افریقہ عیسائیت کی سر توڑ تبلیغ کو شکست فاش دے کر مسلسل
اسلام کی سمت آتا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

رباط نشیں صوفیوں نے یہ خو بو مراکش کے والا مرتبت صوفی حضرت شیخ ابومدین
(وفات ۱۱۹۸ء) کی سادہ اور پاک زندگی کے نمونہ سے لی ہے۔ وہ زیادہ پڑھے
لکھے نہیں تھے انھوں نے روحانی ریاضتوں یا نظریاتی جھمیلوں میں پڑے بغیر طرز
حیات کو خلوص میں رنگ دینے اور توحید کے اصل معانی کے احساس کرنے پر زور
دیا۔ ان کے سلسلہ کے شیخ احمد الشاذلی (وفات ۱۲۵۸ء) نے اس سادہ اور
پرکار تصوف کو اور آگے بڑھایا۔ شیخ شاذلی بہت بڑے عالم تھے۔ انھوں نے سلسلۂ
شاذلیہ میں ہر پیشہ اور طبقہ کے افراد کی بیعت لی اور ان کو حکم دیا گیا وہ دنیاوی معاملات
بدستور انجام دیتے رہیں لیکن زندگی کو شریعت کے تابع رکھیں۔ سلسلۂ شاذلیہ میں ذکر
و اعمال کا کوئی لگا بندھا سانچہ نہیں اور نہ خانقاہوں کو مرکز بنانے کا دستور ہے۔
شاذلی طریقہ کے پیرو تمام افریقہ کے بڑے شہروں اور خود عرب میں موجود ہیں۔ حضرت
شیخ شاذلی نے اسکندریہ میں قیام کیا اور وہیں ہزاروں افراد کو فیضیاب کر کے سلسلۂ
شاذلیہ افریقہ و عرب میں پھیلایا جس کے اثر سے شہری باشندوں میں اسلام اور
شریعت سے گہری اور سچی وابستگی پیدا ہوئی۔ یہ سلسلہ آگے چل کر بہت زیادہ جذبات
کی گرمی اور سرمستی کا علمبردار بن گیا۔

ترکوں، منگول اور تاتاری نسل کے علاقوں میں سب سے زیادہ قدیم سلسلہ بکتاشیہ ہے۔ یہ روحانی مدارج اور کشف و مراقبے پر اپنی بنیاد رکھتا ہے۔ اور بہت کچھ رسم و رواج اس نے قدیم بازنطینی راہبوں کے اختیار کر لئے تھے۔ مثلاً یہ سلسلہ ذکر و اذکار کے وقت عیسائی عشائے ربانی کی پیروی میں بے پردہ عورتوں اور مردوں کی شرکت اس محفل میں جائز سمجھتا تھا جہاں پہلے سب لوگ مل کر روٹی اور پنیر کھاتے اور اسکے بعد اپنے مرشدوں سے جو بابا کہلاتے تھے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے اور انکو معاف کراتے تھے۔ بکتاشیہ کا اثر ترکی لشکر 'ینی چری' پر بہت تھا جو نومسلم فرنگی غلاموں کی جماعت تھی۔ بکتاشیہ اور "ینی چری" نے بارہا بغاوتیں کرکے ترکی سلطنت کو کمزور کیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۲۶ء میں ان کا قلع قمع کر دیا گیا۔ ترکی میں پڑھے لکھے شہری باشندے مولانا جلال الدین رومی (وفات ۱۲۷۳ء) کے قائم کردہ سلسلۂ مولویہ کے زیادہ مخلص و معتقد تھے اور سلسلۂ مولویہ اپنے جذب و سرمستی اور روحانی ادبیات سے خاص شغف رکھنے کی وجہ سے بہت شہرت رکھتا ہے۔ وسط ایشیا کے تاتاری اور مغل مسلمانوں میں حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبندی (وفات ۱۴۵۳ء) کے قائم کردہ سلسلۂ نقشبندیہ نے بڑا رواج پایا۔ اور وہیں سے یہ سلسلہ ہندستان پہنچا۔

○

ہندوستان میں تبلیغ اسلام اور تاریخ تصوف کا ایک ساتھ آغاز ہوا ہے۔ اس ملک میں سب سے پہلے صوفی شیخ اسماعیل بخاری ہی نے ہندستان میں بڑے پیمانے پر تبلیغ کی اور لاہور میں ۱۰۰۵ء میں وارد ہوئے۔ انکے بعد شیخ علی بن عثمان ہجویری (وفات ۱۰۷۲ء) نے جو داتا گنج بخش کہلاتے ہیں سلسلہ تبلیغ قائم کیا، صدہا صوفی

کارکنوں کی تربیت کر کے ان کو ہر سمت پھیلا دیا اور علم تصوف کی اہم کتابیں مثلاً
کشف المحجوب لکھیں۔ آپ کے فیض یافتہ خواجہ معین الدین چشتی (وفات ۱۲۳۶ء)
نے اجمیر میں مرکز قائم فرمایا اور دکن میں تبلیغ کی۔ ملتان میں شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی
(وفات ۱۲۶۶ء) کی وجہ سے مغربی ہندوستان میں اسلام پھیلا آپ کے جانشین
شیخ رکن الدین عارف باللہ کے شاگرد خاص سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشت
نے گجرات میں تبلیغ جاری کی۔ دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (وفات ۱۲۳۶ء)
نے تعلیم و تربیت کا مرکز قائم کیا تھا۔ پھر خواجہ فریدالدین شکر گنج (وفات ۱۲۶۵ء)
نے پاک پٹن کو تبلیغی مرکز قرار دیا انہی کے بھانجے مخدوم علاؤ الدین صابر کلیری
(وفات ۱۲۹۱ء) نے گنگا کے میدانوں میں تبلیغ کے لئے کارکن تیار کئے۔ شکر گنج
کے سب سے بڑے خلیفہ حضرت نظام الدین اولیا (وفات ۱۳۲۵ء) تھے جو ہندوستان
کے سب سے بڑے صوفی تسلیم کئے گئے، سلطان بلبن نے اپنی لڑکی ان کے نکاح میں
دی اور آپ کے اثر سے دلی کی سلطنت کے نظم و نسق میں تبدیلیاں کی گئیں۔
سلسلۂ چشتیہ نظامیہ آپ سے جاری ہوا ہے۔ اس میں ہندوستانیت کے بہت سے
عناصر اس لئے روا رکھے گئے تھے کہ عوام میں نفوذ کیا جا سکے۔ نظام الدین اولیا
کے جانشین حضرت نصیر الدین چراغ دہلی (وفات ۱۳۵۶ء) نے سلسلہ کو مزید ترقی دی،
خواجہ کمال الدین کو احمد آباد، مولانا خواجگی اور شیخ احمد تھانیسری کو کالپی اور خواجہ
سید محمد گیسو دراز (وفات ۱۴۲۲ء) کو گلبرگہ (دکن) روانہ کیا۔ خواجہ سید محمد گیسو دراز
نے بے شمار کتابیں لکھی ہیں جن میں معراج العاشقین اردو کی قدیم ترین کتب
میں شمار ہوتی ہے۔

بنگال میں شیخ جلال الدین تبریزی (وفات ۱۲۲۵ء) نے تبلیغی کام جاری کیا۔ اور بڑی کامیابی حاصل کی پھر نظام الدین اولیا نے شیخ سراج الدین بدایونی کو بنگال روانہ کیا، انکے جانشین میر اشرف سمنانی نے بنگال میں خانقاہوں اور مدرسوں کا جال بچھادیا اسی طرح کشمیر میں پہلے حضرت شاہ مرزا نے تبلیغ کی پھر اپنی سلطنت قائم کرکے ملک کو ترقی دی انکے بعد امیر کبیر ہمدانی (وفات ۱۳۸۵ء) نے کشمیر کی اکثریت کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا۔

○

ان قدیم ہندوستانی صوفیوں نے ملک پر گہرا اثر ڈالا ہے، انکی وجہ سے یہاں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہی نہیں پیدا ہوئی بلکہ ہندو عناصر بھی متاثر ہوئے اور ان میں بھگتی تحریک صوفیوں کی نقل میں پیدا ہوئی۔ خانقاہوں نے زمانہ قدیم میں روشنی کے مرکزوں کی حیثیت بنالی تھی۔ یہاں باقاعدہ مدرسے قائم ہوتے تھے اور مروجہ علوم کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ عوامی زندگی کے مرکز تھے جہاں حکمرانوں کے غرور اور بالادست طبقہ کے تکبّر کی جگہ میل جول اور سمجھنے سمجھانے کے جذبے کارفرما تھے۔ صوفیوں کی خانقاہیں عام آبادی کے لئے مدرسہ، تربیت گاہ اور سماجی مرکز تینوں تھیں۔ یہاں اسلامی علوم کے پہلو بہ پہلو ہندوستانی فلسفے کی چھان بین، مقامی بولیوں کے پرچے اور موسیقی کے نغمات، ہر چیز کی قدر تھی۔ آگے چل کر صوفیوں سے علم دوستی رخصت ہوگئی تو خانقاہیں ویران ہونے لگیں اور اب زندگی کے ان پرانے مرکزوں کی یادگار صرف خستہ حال مقبرے ہیں جہاں سال بھر میں ایک دو بار عرس و میلے کی ہنگامی گرمی ہمارے صوفی بزرگوں کی جیتی جاگتی ہمہ گیر زندگی کا مرثیہ پڑھتی ہے اور بس!

نشاۃ ثانیہ
کی
لہر

تیرہ صدیوں کے زمانے میں اسلام نے اپنے آپ کو کرۂ زمین پر جو معاشی اور سیاسی تبدیلیوں اور انسانی ذہن کے مادی ارتقار کے ساتھ ساتھ برابر بدلتی رہی ہے اپنی تخلیقی قوت کے ساتھ خود کو زندہ رکھا اور اپنے باطن و ظاہر میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام کی تخلیقی قوت ہر زمانے میں جاری رہی۔ کتاب اللہ اور سنت رسول کے سرچشموں سے ذہنی تصورات اور قانون و طرز حیات کے بنانے اور انکو قائم رکھنے کے لئے استفادہ کی راہ کھلی رہی۔ اسلامی تہذیب میں غیر اسلامی عناصر داخل ہوتے رہے اور ان کی وجہ سے قانون اور عقیدہ کے اصل تصورات کو بار بار عزم و ارادہ اور اخلاق سے کام لے کر ان کو اسلامی تہذیب سے خارج کرنا پڑا لیکن اصل اسلام ہمیشہ موجود رہا۔ اس کی توانائی میں کبھی کمی نہیں آئی۔ ماضی میں اس نے غیر اسلامی عناصر سے کامیاب جنگ کی۔ زمانہ حال میں یہ مغربی افکار کو شکست دے رہا ہے اور مستقبل میں اس کا زبردست تخلیقی کام جاری رہیگا۔ انشاراللہ۔

اسلام نے جو تمدن و تہذیب پیدا کئے وہ ایک پیوست و متناسب جسد و روح رکھتے ہیں۔ اسلام نے توحید و معاد کے نظریے سے ہمیشہ دنیا بدلی اور خطروں کو رفع کیا۔ توحید اور معاد ہی نے نئی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے اور ماحول، وقت اور فضا کی ناسازگاری کو سازگار بنانے کا سبق دیا۔ انفرادی طور سے مسلمان قانون الٰہی کی حفاظت اور اس کے قیام و نفاذ کے لئے ہمہ تن آمادہ رہتے ہیں اور شریعت اور فقہ کے اقدارِ حیات کو بار بار تشریح اور تعبیر سے اپنی اجتماعی زندگی میں وہ درجہ دیتے ہیں جو اسلام کے احکام کے مطابق دنیا میں فلاح اور آخرت میں نجات کا سبب ہے۔

زمانہ حال میں اسلامی ممالک کو مغربی استعمار سے سابقہ پڑا ہے صنعتی تمدن کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام نے ان کو پہلے اپنا نشانہ بنایا اور اس کے بعد ان کے لئے مغربی تمدن کے خراب اثرات و نتائج سے نپٹنے کا سوال پیدا ہوا۔ ہر جگہ اسلام کے غیر اسلامی عناصر نے یورش کی اور مغربی افکار نے مسلم معاشرے میں انتشار پیدا کیا لیکن صنعتی تمدن کی دنیا میں سترھویں اور اٹھارویں صدیوں کی آمد آمد کے ساتھ ساتھ خود اسلام کی قوت تخلیق میں ایک عظیم حرکت پیدا ہو چکی تھی۔ سائنسی افکار کے دنیا پر چھانے سے پہلے اسلامی تہذیب نے وا ہمے، خرافیات اور شرک کے خلاف کامیاب محاذ کھول دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے زمانۂ حال میں سائنسی افکار اور بیدین نظام سیاست اور معاشیات کے حملوں کو بڑی آسانی سے پیچھے ڈھکیل دیا اور اسلامی نظام حیات پر اپنے یقین و ایمان کا اعادہ کرکے احیائے اسلام کا فرض قدیم بڑی خوبی اور آسانی سے پورا کیا۔ سترھویں صدی میں اسلام کی قوت تخلیق کو چار نمایاں اشخاص نے جگایا اور اس کی نمایندگی عقیدہ، یقین اور عمل کے نئے اسالیب قائم کرکے کی ہے۔ انکی وجہ سے اسلام

کو مغربی افکار کی لہر کوئی نقصان نہ پہونچا سکی اور جہاں اس نے خود مغرب کے عیسائی ملکوں میں کلیسا اور اسکے نظام عقاید کو پاش پاش کر کے، بے دینی کو علمی فیشن بنا دیا ہے وہاں مغربی افکار سے عالم اسلام میں نظام عقاید و قانون پر کوئی مضر اثر تو کیا پڑتا، اُلٹا جدید صنعتی تمدن کے حالات اور ان کے تقاضوں کے مطابق، اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام کی جدید تعبیر و تفسیر ہونے لگی اور ایک نظام حیات کی حیثیت میں اسلام کے نئے پہلو، مزید خوبیاں اور زیادہ اہمیت رکھنے والے گوشے سامنے آگئے۔ اس گزرنے والے زمانے میں عالم اسلام میں تجدید و احیاء کی یہ لہر مغربی تمدن اور اسکے صنعتی مادی تہذیب کے نظام خیالات کے پختہ ہونے اور ایشیا و افریقہ میں پھیلنے سے قبل اُٹھ چکی تھی۔ یورپ نے بے قید و بے لگام عقل و دانش کے ہنگاموں میں دین و روحانیات کو جلا کے راکھ کر دیا ہے مگر عالم اسلام میں تجدید و احیا نے عقل و دانش کو توازن اور اطاعت الٰہی کے ماتحت رکھ کے واہمے، خرافیات، شرک و کفر کے سارے قدیم عقاید کو فنا کر دیا ہے اور اسلام خالص کی جستجو میں کامیاب ہو کے عالم اسلامی نشاۃ ثانیہ اور عروج و ارتقا کی شاہ راہ پر آگیا ہے۔

○

تجدید و احیائے دین کی یہ لہر مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (وفات ۱۶۲۴ء) کے وقت شروع ہوئی۔ انھوں نے اسلام کے نظام حیات اور اس کے قیام کے لئے جد و جہد کا آغاز کیا۔ زوال پذیر فضا میں دنیا سے فرار اور واہمہ پرستی کے عناصر سے جنگ کی۔ تصوف نے وہم و خیال کی جو رنگا رنگ دنیا بسائی تھی

اسکو توڑ کے حقائق و معارف کی دنیا قائم کی۔ وحدت الوجود کے نظریے نے عالم اسلام میں عقاید و اعمال پر برا اثر حد انتہا تک ڈال رکھا تھا۔ توحید اس سے پسِ پشت جا پڑی تھی۔ وحدت الوجود کا قائل فرد اپنے آپ کو ذاتِ مطلق کا ایک حصہ سمجھ کے، اس دنیا میں شریعت و فقہ سے بے پرواہ تھا اور نظام حیات اسلام کی جگہ غیر اسلام کے ہاتھوں آگیا تھا۔ صوفی تحریک کا مقصد اس زمانے میں وحدت الوجود کا پرچار تھا جو دنیا کے معاملات سے علیحدگی، واہمے میں گم رہنا، خیال کے خمار میں جینا اور حقائق حیات و کائنات کی جگہ تصور کے خرافیات پر اعتماد سکھاتا تھا۔ مجدد الف ثانی نے وحدت الوجود کے نظریے کو خارج کرکے وحدت الشہود کا نظریہ صوفی تحریک کو دیا جو خرد کو اسلام کے عملی نظام حیات میں عمل و حرکت کا مقام عطا کرتا ہے اور ذہنی واہمات کو مسترد کرکے دانش و شریعت کی روشنی سے کام لینے کا سبق دیتا ہے۔ انکی کامیابی نے شرک و واہمہ کا خاتمہ کردیا اور مسلمانوں کی توجہ دنیا پر ہونے لگی جس کی درستگی اور سنوارنے کے فریضہ سے معاد و آخرت درست ہوتے ہیں۔ غیر اسلامی عناصر کے خلاف اس کامیاب جہاد میں مجدد الف ثانی کے بعد شیخ عبدالغنی نابلوسی (وفات ۱۷۳۱ء) اور علامہ محمد مرتضیٰ زبیدی (وفات ۱۷۹۱ء) کا زمانہ آیا۔ شیخ نابلوسی نے شام و مصر میں تصوف کو شعبدے بازی، واہمات و شرک سے پاک کیا اور علامہ زبیدی نے یمن، عرب اور افریقہ کے مسلم علاقوں پر اپنا اثر ڈالا انھوں نے امام غزالی کی طرح تصوف کی گمراہیوں پر سخت نکتہ چینی کی اور اسلام کے روحانی اقدار کے حصول کے لئے اسکے نظام شریعت و قانون کے کامل اتباع پر زور دیا۔ ان تین عظیم افراد نے ذہن بدل ڈالے اور گمراہ تصوف کی انفرادیت

پرستی اور انتشار پرستی کو اجتماعی حرکت و مرکز پرستی میں ڈھال دیا۔ علمائے اسلام کو اس تبدیلی کے بعد موقعہ ملا کہ وہ حالات کے مقابلے کے لئے اسلام کے نظام قانون کا مطالعہ نئے نقطۂ نظر سے کریں اور اجتہاد سے کام لیکر اسلامی نظام کو نئی قوت و شوکت سے مالا مال کریں۔ یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ زندگی سے فرار، واہمہ پرستی کا دور دورہ ہے اور گمراہ صوفی نظریات کے خمار سے مسلمانوں کے ذہین طبقے کو انفرادیت کی پرستش اور فرار کا مزہ چکھا رکھا تھا۔

اٹھارویں صدی تک سارے عالم اسلام میں تجدید و احیائے دین کی یہ لہر دوڑ چکی تھی۔ خارجی عناصر کو نکال پھینکنے اور نظام اسلام کو قائم کرنے کا جذبہ عروج پر آچکا تھا۔ سرزمین عرب میں امام محمد بن عبدالوہاب کی کوششوں سے حنبلی فقہ اور عقاید کی تجدید ہو چکی تھی۔ شرک اور واہمہ پرستی کے خلاف نجد و حجاز میں بیداری آگئی تھی۔ جس نے سنہ ۱۸۰۲ء میں عراق تک اپنے اثرات پھیلا دئے تھے اور خلیج فارس بحیرہ احمر اور بحر ہند میں انگریزوں، فرانسیسیوں، پرتگیزوں سے بحری معرکوں میں مصروف تھے۔ عربی سادگی، خلوص اور اسلام پر پورے یقین نے امام محمد بن عبدالوہاب کے پیروؤں کو عرب و عراق میں حکمراں بنا دیا تھا گو مغربی سامراجیوں کے دباؤ کی وجہ سے ۱۸۱۸ء میں ترکی سلطنت کے سپہ سالار محمد علی خدیو مصر نے اس تحریک کے رہنما سعودی خاندان کو شکست دے کے اسکے علاقے پر قبضہ جمالیا اور مغربی ملکوں کو بحری راستوں میں اطمینان کی سانس لینے کا موقعہ مل گیا مگر عرب میں حنبلی فقے کی اس نئی کروٹ نے سارے عالم اسلامی کو چونکا دیا اور خلافت راشدہ کے زمانے کے سادہ، اخلاص و ایمان اور توحید و تقویٰ سے بھرپور اسلام کو واہمات، غیر اسلامی عناصر

اور خرافیات پر ترجیح دینے کا جذبہ عام ہوگیا۔ چنانچہ سید احمد ابن ادریس (وفات ۱۸۳۷ء) نے مکہ معظمہ میں ایک نئے سلسلۂ تصوف کی بنیاد ڈالی جس نے آگے چل کر سارے افریقہ میں تجدید و احیا کی لہر دوڑا دی اور عمل و فعل میں اسلامیت کے پہلو بہ پہلو سلسلہ ادریسیہ نے فرنگی سامراج سے جہاد کو بھی اپنا مسلک بنایا۔ حضرت شیخ ابن ادریس نے سلسلہ ادریسیہ میں اسلامی زندگی بسر کرنے کو روحانی ترقی کا ذریعہ قرار دیا۔ قیاس و اجتہاد کو صرف خلافت راشدہ کے زمانے تک درست تسلیم کیا۔ حنبلی فقہ کے مطابق قانون فقہ میں کتاب اللہ اور احادیث رسول کو آخری سند قرار دیا اور وحدت الوجود کو شرک ہی نہیں، کفر صریح کہہ کے مسترد کیا۔ آپ نے اپنے سلسلے کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ وہ فنا فی الرسول کے مقام کے لئے کوشاں ہو تاکہ رسول اللہ کے روحانی فیوض و برکات سے دنیا کی بھلائی اور آخرت میں نجات نصیب ہو، سلسلہ ادریسیہ کے دو تابع سلسلے، شیخ محمد بن سنوسی الجزائری (وفات ۱۸۵۹ء) اور شیخ عثمان امیر الغنی (وفات ۱۸۵۳ء) بھی انہی عقاید کے تبلیغ کرنے والے ہیں۔ یہ وہ صوفی سلسلے ہیں جنھوں نے خانقاہوں میں پناہ نہیں لی۔ زندگی سے بھاگے نہیں، بلکہ جد و جہد کی، جہاد بھی کیا سنوسی صوفیوں نے طرابلس میں اطالیوں سے جہاد کیا اور وسط افریقہ میں فرانسیسی سامراج سے مسلسل جنگ کی۔ اور آخر ان دنوں طرابلس میں سلسلہ سنوسی کے شیخ ادریس کو حکمرانی مل گئی۔ سلسلہ امیریہ نے عدن کے سامنے سمالی لینڈ میں انگریزوں، اطالیوں اور فرانسیسیوں سے جہاد کیا اور اسکے اثرات سے سوڈان میں محمد احمد مہدی سوڈانی (وفات ۱۸۸۵ء) نے وہ جنگ آزادی شروع کی تھی۔ جس میں انگریزوں کو شکست کھاکے سوڈان سے عرصہ کے لئے نکل جانا پڑا تھا۔ اب بھی جمہوریہ سوڈان میں مہدی سوڈانی کے سلسلہ

مہدیہ کے بکثرت پیرو ہیں۔ اور شیخ عبدالرحمن المہدی انکے روحانی و سیاسی رہنما کی حیثیت سے سوڈان کی سیاسیات پر بڑا اثر رکھتے ہیں۔ بہرصورت نجد و حجاز سے حنبلی فقہ کی تجدید نے عرب و افریقہ دونوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑادی اور ان علاقوں میں اسلام کے خالص اور بے میل نظام حیات پر عمل کرنے کا عام ذوق و شوق پیدا کردیا ہے۔ سیاسی میدان میں بھی اسکے نمایاں اثرات رہے جو مغربی استعمار سے جہاد کی مسلسل تحریکوں میں ظاہر ہوتے رہے جسکی مثال غیر مذہبی، لیکن اسلامی سیاست کے قائل رہنماؤں امیر عبدالقادر الجزائری (وفات ۱۸۳۶ء) عربی پاشا مصری (وفات ۱۹۱۱ء) اور امیر عبدالکریم ریفی سے ملتی ہے جنھوں نے ۱۹۲۴ء میں مراکش و ریف میں فرانسیسیوں سے جنگ کی تھی۔ فلسطین کے مفتی اعظم حاجی امین الحسینی اور سعودی عرب کے بانی امیر عبدالعزیز (وفات ۱۹۵۴ء) بھی اسی جذبہ تجدید و احیاء اسلام سے متاثر تھے۔

○

مغربی استعمار سے تصادم لینے والے یہ مجاہدین اسلام وہ تھے جنھوں نے اپنے آپکو قومی، مقامی، نسلی، خرافیات سے پاک کرلیا تھا۔ وہابیت اور شرک سے دور ہو کے انھوں نے اپنا ناتہ ارکان اسلام سے جوڑ لیا تھا۔ روزہ، نماز، زکوٰۃ اور حج انکے روحانی مدارج کے لئے کافی تھے۔ ملت اسلامیہ کو زندہ رکھنے کے جذبے نے ان مجاہد گروہوں کو فوجی اور سیاسی تنظیم کی طرف متوجہ کیا تھا، یہ اپنے امیر کی قیادت میں جہاد کرنا فرض سمجھتے تھے۔ عرب و افریقہ میں انھوں نے خالص اسلام کی تبلیغ کی، غیر مسلموں کو مسلمان بنایا اور مسلمانوں کو بدعت کے پنجے سے چھڑا کے شریعت کی آغوش میں لائے۔

توحید کا غلبہ ان پر سب سے زیادہ تھا۔ اس لئے یہ نہ تو انفرادی زندگی میں علامتوں و مظاہر کی پرستش برداشت کرتے تھے نہ مغربی استعمار کو اس بات کا حق دینے کے لئے تیار تھے کہ وہ عرب و افریقہ سے معدنیات کی دولت لوٹنے اور انکو اپنا بازار بنانے کے لئے وہاں اپنا اقتدار قائم کرے اور اسلام کی سلطنت کو ختم کردے۔ انکو تینے مخالف حالات سے سابقہ رہا اور اس قدر مخالفت، اپنے اور غیروں کی برداشت کرنا پڑی کہ انھوں نے مجبور ہوکے نرمی و اعتدال کو خیرباد کہدیا اور خالص اسلام کی خاطر جان ومال کی بازی لگادی۔ ان کو مسلسل جنگ کا مسلک اپنانا پڑا۔
امام محمد بن عبدالوہاب کے پیرو خاندان سعود کو سامراجی اشاروں پر خود مسلمان مصریوں اور ترکوں نے ختم کیا اور اسکی تجدید کے وقت سلطان عبدالعزیز کو پہلے نجد و حجاز میں ایک غاصب غلام سے لڑنا پڑا اور پھر شریف حسین سے جنگ کرنا پڑی۔ سلسلۂ سنوسیہ کو بھی سب سے پہلے ترکوں نے دبانا چاہا پھر اطالیہ کے حملہ طرابلس ۱۹۱۱ء کے موقعہ پر انھوں نے کچھ عرصے سنوسی تحریک کی مدد کی اسکے بعد پھر سنوسی سلسلے کو افریقہ کے وسط میں فرانسیسی سامراج سے اور طرابلس میں اطالوی سامراج سے مقابلہ پڑا جس میں بعض مسلمان قبائل نے سنوسی تحریک کے مقابلے پر مغربی سامراجیوں کا آلہ کار بن جانا قبول کرلیا تھا۔ مراکش میں حضرت شیخ احمد تیجانی (وفات ۱۸۱۵ء) کے سلسلۂ تیجانیہ نے دو صدی تک مسلسل اسپین اور فرانس کے استعمار کی مزاحمت کی۔ اسکے خلاف افریقہ کے حبشی قبائل ہی نہ تھے بلکہ تیونس کے حکمراں اور مراکش کے سلطان نے بھی سلسلہ تیجانیہ کو نقصان پہونچانے میں اپنا اثر، روپیہ اور لشکر استعمال کیا۔ ہندوستان میں مجدد الف ثانی کی تحریک کے مخالف نام نہاد صوفی اور عالم ہی تھے جو مغل دربار و

کا حق نمک ادا کر رہے تھے۔ شاہ ولی اللہ کے خیالات نے جس تحریک جہاد کو جنم دیا، اسکے سرکردہ رہنما سید احمد بریلوی تھے (شہادت ۱۸۳۱ء) اور انکے رفقا کو بھی اپنوں ہی نے نقصان پہونچایا۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کے زمانے میں اور اس کے بعد برابر تحریک تجدید پر مغربی استعمار کے پہلو بہ پہلو نام نہاد مسلمانوں کے حملے ہوتے رہے۔

اسلامی تہذیب میں غیر اسلامی عناصر کی یہ موجودگی صرف اتنا کر سکی کہ اس نے اکثر علمی کامیابیوں کو پچاس، ساٹھ یا سو سال کے لئے ملتوی کر دیا لیکن جو ذہنی حرکت جنم لے چکی تھی وہ دو ہرے دباؤ کو ہٹا کے عالم اسلام میں پھیل گئی اور مراکش سے ملایا تک ہر جگہ خالص اسلام کی تلاش اور جستجو اور اسکے علاوہ مقامی بدعتوں وقتی ہنگاموں اور غیر اسلامی عناصر کو انفرادی اور اجتماعی زندگی سے نکال پھینکنے کا جذبہ برابر اپنا کام کرتا رہا۔ یہ آج بھی پوری شدت سے موجود ہے اور اپنی منزل مقصود خالص اسلام کی طرف سرگرم سفر ہے۔

○

اسلام کے نظام عقاید اور اسکے نظام قانون سے استفادہ کر کے مغربی تہذیب کے سیلاب کا مقابلہ کرنا ایک ایسا کام تھا جو صرف علمی محاذ پر ممکن تھا۔ اس کام کا آغاز بھی سترھویں صدی میں ہو چکا ہے۔ اس محاذ پر سب سے بڑا کارنامہ شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات ۱۷۶۲ء) نے انجام دیا۔ وہ غیر معمولی ذہن لے کے پیدا ہوئے تھے مغل عہد کے زوال پذیر تمدن، اسکے خراب و خستہ علوم و فنون اور اسلامی معاشرے کی عالمگیر کمزوریوں کا جائزہ لیکر انھوں نے عقاید کی اصلاح کی اور نظام قانون کی تعبیر و تشریح

کرکے اسکو قائم کرنے کی مہم شروع کی۔ شاہ ولی اللہ نے نظام اسلامی کا جو خاکہ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں پیش کیا تھا اس نے ہندستان میں ہی نہیں بلکہ عرب و مصر میں بھی ذہنوں کو متاثر کیا اور یہ کتاب جامعہ ازہر کے نصاب سے لیکر تمام اسلامی دنیا کے گھروں اور مدرسوں تک پہونچ گئی۔ شاہ ولی اللہ ایک ایسے عالم تھے جو صدیوں کے زمانے تک دیکھتے اور زمان و مکاں سے ماوراء ہو کے سوچتے ہیں انھوں نے اجتماعی نظام کے قیام کے لئے فکر و نظر ہموار کی اور اسلام کے فلسفہ حیات کو عملی طور پر منطبق کرنے کا راستہ دکھایا۔ تصوف، عقاید، قانون، فرقہ واری اختلافات اور سیاسی و معاشی نظام کی خامیاں، کوئی چیز انکی نگاہ ژرف بیں سے پوشیدہ نہ تھی۔ اسلئے انھوں نے ہمہ جہتی اور ہمہ گیر انقلاب کی دعوت دی اور مسلمانوں کو اسلام کے قیام و نفاذ کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے پکارا انھوں نے علمی محاذ پر وہ کام کردکھایا کہ عقاید و قانون کو سمجھنے سمجھانے اور اسکی تعلیم و تدریس میں زمین و آسماں کا انقلاب پیدا ہوگیا اس طرح مغربی تہذیب کے سیلاب سے قبل ہی علمی محاذ پر اسلامی تصورات کو شاہ ولی اللہ دہلوی کے ہاتھوں فیصلہ کن حملے کا مقام حاصل ہوچکا تھا اور اسلام پر کھلے دل و دماغ سے غور و فکر جاری تھا۔ جس نے روشن خیالی، اصابت فکر، اسلام فہمی اور تعبیر و تشریح کو عام کردیا ہے۔ اجتہاد کے ہمراہ اسلام کی مرکزیت اور اسلامی روایات کی سختی سے پاسداری شاہ ولی اللہ دہلوی کے علمی کارناموں نے عام کی۔ وہ عہد جدید کے فکری رہنما ہیں اور تجدید و احیائے دین کی تحریک کے فلسفی، نظریہ ساز اور مؤرخ بھی انھوں نے اسلام کے عقاید اور قانون سازی کی تاریخ کا عقلی جائزہ لیا تھا، کہنگی، تنگ نظری کو مسترد کردیا تھا اور یہ قیاس و اجتہاد سے کام لینے اور زندہ رہنے

کے طریقے کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ امام غزالی کی طرح باطنی نفسیات کے مطلع بھی تھے اور امام ابو حنیفہ کی طرح اسلام کے اجتماعی قانون کے ماہر بھی تھے۔

○

پھر انیسویں صدی آئی جس میں تحریک احیاء نے ایک تلخ سبق سیکھا۔ کیونکہ ہر محاذ پر مغربی سامراج کے صنعتی نظام نے برتر ہتھیاروں سے کام لے کر مجاہدین اسلام کو شکست دیدی تھی۔ اور جدید طرز کی رائفلوں توپ خانوں اور گن مشینوں نے اسلامی ممالک کو رفتہ رفتہ مغربی استعمار کے پنجے میں دیدیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندستان سے مسلم اقتدار ختم ہوگیا اس سے قبل الجزائر مراکش اور تیونس پر سامراجی گرفت ہوچکی تھی۔ سواحل عرب پر غیروں کے فوجی اڈے بن چکے تھے۔ مصر، ایران، افغانستان میں مداخلت جاری تھی، افریقہ پر سامراجی ممالک کا تسلط ہوچکا تھا۔ ملایا اور انڈونیشیا غلام ہوچکے تھے اور عالم اسلام پر دن بہ دن مغربی ملکوں کا نرغہ مضبوط ہورہا تھا۔ سب سے بڑی طاقت ترک حکمرانوں کی تھی جو تین صدیوں سے مغربی ملکوں سے لڑتے لڑتے اب ہتیاروں اور صنعتی قوت کی کمی اور خرابی کی وجہ سے بے دم اور شکست خوردہ ہوچلے تھے۔ اس طرح اندازہ ہوتا تھا کہ عالم اسلام میں منتشر اور تنہا اسلامی تحریکوں کے بس میں نہیں ہے کہ وہ الگ الگ رہ کے لڑیں اور دشمنوں پر فتح حاصل کریں۔ ضرورت اسلام کے لئے ایک مرکزی اتحاد کی تھی۔ جو پھیلی ہوئی قوت و توانائی کو ایک جگہ کر کے مقابلے و مزاحمت میں کامیاب ہوجائے۔

علامہ جمال الدین افغانی (وفات ۱۸۹۷ء) نے ان حالات میں پان اسلام ازم: تحریک اتحاد اسلامی کی دعوت شروع کی۔ وہ پہلے افغانستان اور پھر ایران

میں غیر ملکی استبداد کے خلاف مہم چلا چکے تھے۔ انھوں نے تمام عالم اسلام کی سیاحت کی اور پیرس سے ۱۸۸۳ء میں ایک عربی جریدہ عروۃ الوثقیٰ جاری کیا جو اتحاد اسلامی اور سیاسی اصلاح کی دعوت دیتا تھا۔ علامہ افغانی کا یقین تھا کہ مسلمان بادشاہوں نے اسلام کو کمزور بنا دیا ہے اور مسلم ممالک کو ایک سلطنت جمہوری میں متحد ہو کے جدید مغربی تمدن سے فوجی، سیاسی، انتظامی اور صنعتی خوبیاں حاصل کرنا چاہیں تاکہ وہ مغرب کا جم کے مقابلہ کر سکیں۔ وہ مشرقی ممالک کی اندرونی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے اتنی ہی کوشاں تھے جتنے کہ اتحاد اسلامی اور مغربی ملکوں کے استبداد کو روکنے کے لئے بے قرار تھے۔ علاّمہ افغانی کے خیالات نے افغانستان ایران، مصر، ترکی اور ہندوستان ہر جگہ اثر ڈالا اور اسکے مختلف ملکوں میں مختلف نتیجے ہوئے۔ جن کا جائزہ لینا اسلام کے عہد جدید کو سمجھنے کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ انکے خیالات نے ممالک اسلامیہ کی سیاسیات اور دینی تصوّرات دونوں کو متاثر کیا ہے۔

○

علامہ افغانی نے ایک متحدہ جمہوریہ اسلامیہ کا خواب دیکھا تھا جسکی شکل و صورت زمانہ حال کے تقاضوں کے مطابق ہو، رُوح اصل و خالص اسلام کی ہو اور جو جدید سائنس و ٹکنالوجی کی قوت سے مالا مال بھی ہو لیکن یہ خواب پورا نہیں ہوا اسکی وجہ یہ ہے کہ مسلم ممالک میں قوم پرست عناصر نے رفتہ رفتہ قابو پالیا۔ ۱۹۲۲ء میں ترکوں نے خلافت ختم کر کے ترکی نسل کی ترک حکومت قائم کر دی۔ ۱۹۱۴ء کے بعد عربوں میں عرب اتحاد قومی کا جذبہ پروان چڑھا جس نے پہلی جنگ عظیم میں ان کو

ترکوں سے بغاوت پر اُکسایا تھا۔ ایران و افغانستان میں جمہوری سلطنت اور آزادی کے لئے جدوجہد قومی رنگ میں ڈوب گئی اور خود مصر میں مصری قومیت نے بڑی توانائی حاصل کرلی لیکن اتحاد اسلامی کے لئے ہر مسلم ملک میں ایک بڑا طبقہ بےچین رہا ہے۔ ہندوستان میں مولانا محمد علی (وفات ۱۹۳۱ء) اور مشیر حسین قدوائی (وفات ۱۹۳۶ء) اسکے بڑے حامی تھے۔ مصر میں شیخ حسن البنا (شہادت ۱۹۵۱ء) کی اخوان المسلمون، انڈونیشیا کی جماعت دارالاسلام اور ایران کی جماعت فدائیان اسلام کے سامنے برابر یہی مقصد رہا ہے۔ اسلامی ممالک کے مفکروں میں ترقی کے نامق کمال بے عربی ملک الشعرا احمد شوقی اور ہندوستان کے علامہ شیخ محمد اقبال نے ہمیشہ اتحاد اسلام کے نغمے گائے۔ ایک عالمگیر جمہوریہ اسلام کے تصوّر کا سحر انگیز وکیف آفریں اثر مسلمانوں کے دل دماغ کو ہمیشہ حرکت میں لاتا ہے اور جب تک یہ خواب پورا نہ ہوگا اس کا وجود ان کے لئے ضروری رہیگا۔ مسلم ممالک میں قومیت کی لہر کے باوصف باہمی قربت حاصل کرنے کا زبردست رجحان اسی پوشیدہ احساس کا نتیجہ ہے جو جمال الدین افغانی کے لازوال خواب نے پیدا کر رکھا ہے۔

○

تحریک اتحاد اسلامی کے معاملے میں علاّمہ افغانی کا خواب پورا نہیں ہوا لیکن انھوں نے جو دوسرا چراغ جلایا تھا اسکی روشنی ہر جگہ پھیل گئی۔ ممالک اسلامیہ میں اصلاح و تعمیر کا جذبہ اُبھر گیا اور مغربی علوم و فنون کی تحصیل و تعلیم شروع ہوگئی۔ سیاسی، انتظامی، فوجی اور صنعتی معاملات میں مغربی سائنس و ٹکنالوجی کے تجربوں سے فائدہ اُٹھا کے ترقی کی جانے لگی اور اپنے ملک کی دولت کو اپنی ترقی کے

لئے استعمال کرنے کا جذبہ شدت سے پیدا ہوگیا جس نے ہمارے زمانے میں ایشیا اور افریقہ سے مغربی سامراج کے خاتمے کا رنگ اختیار کرلیا ہے اب تیل کے چشمے اور سونے کی کانیں مسلمانوں کے فائدے کے لئے وقف ہو رہی ہیں اور اپنی دولت لٹا کے مغرب سے سامان خریدنے والے ملکوں میں نئے نئے کارخانے کھل رہے ہیں۔ سائنس و ٹکنالوجی پر قدرت حاصل کرنے کی پر زور جدوجہد جاری ہے اور بین الاقوامی سیاسیات میں مسلم ممالک خوف و ہراس سے نہیں بلکہ عزم و ارادے سے کام لے کے اپنے لئے مفید مطلب اقدامات کرتے ہیں۔ یہ علامہ جلال افغانی ہی کا مقرر کردہ عروۃ الوثقی ہے۔

○

خالص دینیاتی میدان میں علامہ جمال الدین افغانی کے افکار نے بڑی تبدیلیاں کی ہیں۔ انکے شاگرد شیخ محمد عبدہٗ (وفات ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) نے سب سے بڑی اسلامی درس گاہ جامعہ ازہر میں فکر و نظر کی نئی لہر پیدا کردی۔ نصاب میں زمانہ حال کی ضرورت کے لحاظ سے تبدیلیاں کی گئیں اور علوم اسلامیہ پر تحقیق و مطالعے کے لئے نئے نئے شعبہ قائم کئے گئے۔ اسلام کے سیاسی، معاشی اصول و مسائل کو دریافت کرنے اور اجتہاد کے ذریعے مسائل جدیدہ کا اسلامی حل پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بڑے بڑے علمی ادارے قائم ہوئے جو قدیم عربی کتابوں کو شائع کرکے عام کر رہے ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ کی قدیم کتابوں کی اشاعت نے علوم اسلامیہ کو بڑی وسعت دیدی ہے اور اسلامی روایات، فنون، علوم اور تاریخ پر بڑی تفصیل سے نگاہ ڈالی جارہی ہے تاکہ اسلام کے زمانہ عروج کی شان و شوکت اور مسلم حکمرانوں کے زمانہ زوال کی خرابیوں پر غور کرکے مستقبل میں کام کرنے اور تعمیر نو کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ شیخ محمد عبدہٗ کے

شاگرد علامہ رشید رضا (وفات ۱۹۳۵ء) نے قدیم فقہی قانون کو مناسب اجتہادات کے بعد زمانۂ حال کے لئے اختیار کرنے کی دعوت دے کے بڑا کام کیا ہے۔ علامہ رشید رضا نے اپنے عربی رسالے "المنار" کے ذریعہ بھی قرآن فہمی کی جدوجہد کی اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد روشن خیالی اور علمی محاذ پر ٹھوس کام کرنے کی تبلیغ کی۔ یوں عام طور پر عالم عرب اور خاص طور پر مصر جدید اسلامی علوم کے ہادی و رہنما بن گئے ہیں۔

○

علامہ جمال الدین افغانی نے مغربی سامراج سے مقابلے کے لئے اسلامی ملکوں کو تیار کرنے کا جو منصوبہ تیار کیا تھا وہ صرف ایک وجہ سے جامۂ عمل نہ پہن سکا یہ وجہ ممالک اسلامیہ میں نسلی بادشاہت کا مستبد نظام تھی۔ علامہ افغانی نے کوشش کی تھی کہ بادشاہت کے کمزور نظام کو دستوری سلطنت کے مرحلے میں لایا جائے تاکہ مغربی سامراج سے ٹکر لینے میں مشرقی ملکوں کی پوری قوت استعمال ہو سکے لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس زمانے میں غیر معمولی شخصیت رکھنے والے دو تاجدار اسلامی دنیا میں موجود تھے اور ذہانت و فراست، سیاست و تدبر، نظم و نسق پر حاکمانہ گرفت، اقتدار پرستی اور شاہانہ تکبر ان دونوں میں کوٹ کوٹ کے بھرا تھا۔ انکی مخالفت میں اٹھنے والی جمہوریت کی لہریں ان سے بہت کمزور تھیں یہ عظیم المرتبت لیکن مستبد تاجدار: امیر عبدالرحمٰن خاں (وفات ۱۹۰۲ء) فرماں روائے افغانستان اور سلطان عبدالحمید خاں (وفات ۱۹۱۱ء) فرماں روائے ترکی تھے۔

ان دونوں نے مجموعی اعتبار سے علامہ افغانی کے خیالات کو قبول کیا تھا۔ مغربی استعمار کی مزاحمت، بین الاقوامی سیاست کے آتار چڑھاؤ سے فائدہ اُٹھانا دونوں خوب جانتے تھے اپنے اپنے ممالک کو دونوں نے جدید اصلاحات و تعمیر سے آراستہ کرنے میں بڑا کام کیا۔ افغانستان اور ترکی کے نظم و نسق، تعلیم، صنعت و تجارت، مالیات اور مسلح افواج کے نظام تربیت میں بیشمار اصلاحات اور افغانستان و ترکی کا عہد جدید میں قدم رکھنا انہی (دو تاجداروں) کا شخصی کارنامہ ہے لیکن ان دونوں نے مسلم ممالک پر شخصی حکمرانی کے رواج کو اپنی کامیابیوں سے مضبوط بھی کیا۔ امیر عبدالرحمٰن خاں کی وجہ سے ایران کی مشروطہ تحریک کمزور پڑی اور سلطان عبدالحمید خاں کی وجہ سے سارے عرب ممالک میں بعد کو پھر تاجداروں کے اقتدار قائم ہوئے۔ جمہوریت کی لہر ان دو بڑے بادشاہوں کے پیروں تلے بری طرح کچلی گئی۔

بادشاہت کی خرابی یہ ہے کہ خاندانی حکمرانوں میں اچھے حکمراں کم پیدا ہوتے ہیں۔ افغانستان اور ترکی کا بھی یہی حال تھا۔ امیر عبدالرحمٰن خاں اور سلطان عبدالحمید کمزور، نالائق حکمرانوں کے ایک طویل سلسلے کے بعد منظر عام پر اُبھرے تھے۔ چنانچہ امیر عبدالرحمٰن کی موت اور ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید کی معزولی کے بعد پھر نالائق حکمرانوں کا سلسلہ ان ملکوں پر مسلط ہو گیا ان دونوں کی مثال نے مسلم ممالک میں تاجداروں کے نظام کو جو تقویت دی اسکے نتیجے میں نجد و حجاز میں امیر عبدالعزیز (وفات ۱۹۵۳ء) ایران میں رضا شاہ (وفات ۱۹۴۴ء) افغانستان میں نادر شاہ (قتل ۱۹۳۳ء) عراق میں امیر فیصل (وفات ۱۹۳۳ء) اردن میں شاہ عبداللہ (قتل ۱۹۵۱ء) برسر اقتدار آئے اور ممالک اسلامیہ میں حریت فکر و نظر اور اتحاد ملی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ حال ہی میں جمہوریت کی لہر نے پھر مصر اور عراق میں اُبھر کے بادشاہت کا خاتمہ کیا ہے۔

ہندستانی مسلمانوں
کی
بیداری

انیسویں صدی کے آغاز ہی سے ہندوستانی مسلمانوں پر عرب ممالک کی تحریک احیائے اسلام کے اثرات پڑنے لگے تھے اب ان میں اپنی بگڑتی ہوئی اخلاقی حالت کو سدھارنے اور اپنی تنظیم کرنے کے جذبے کروٹیں لینے لگے اس کام کی باقاعدہ ابتدا بنگال میں ہوئی جہاں انگریزی سامراج کے ماتحت مسلمانوں کی آبادیاں دیسی ٹھیکہ داروں کے مظالم کا شکار ہو رہی تھیں۔ فریدپور ضلع کے مولانا شریعت اللہ ایک ذہین اور پرجوش رہنما ثابت ہوئے انھوں نے بیس سال تک مکہ مدینے میں قیام کرکے وہاں کے شافعی عالم شیخ طاہر سنبل مکی سے استفادہ کیا تھا یہی زمانہ نجد و حجاز میں وہابی تحریک کے عروج کا تھا۔ ۱۸۰۲ء میں ہندوستان آکے انھوں نے کار اصلاح شروع کیا۔ ۱۸۰۴ء میں وہابی لشکروں نے مدینے میں داخل ہو کے اپنی حکومت قائم کی تو اسی سال مولانا شریعت اللہ نے بنگال میں فرائضی جماعت کی باقاعدہ بنیاد رکھدی۔ اس فرائضی تحریک میں پیر و مرشد کی جگہ استاد اور شاگرد کا رشتہ مقرر کیا گیا۔ تحریک کا رخ عام مسلمانوں میں باہمی اتحاد پیدا کرنے، انکو فرائض اسلام ادا

کرنے پر متوجہ رکھنے کے علاوہ اس زمیندار طبقہ کے خلاف رکھا گیا جو بنگال کے مسلمان
کسانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتا تھا۔ یہ تحریک مولانا شریعت اللہ اور ان کے بعد ان کے
بیٹے دودھو میاں کے زمانے میں سارے بنگال میں پھیل گئی اور اُس نے دیسی زمینداروں،
ایسٹ انڈیا کمپنی کے ٹھیکہ داروں اور خود کمپنی کے خلاف زبردست بیزاری پھیلا دی۔
جون ۱۸۳۱ء میں ضلع پورنیا کے زمینداروں نے مسلمانوں پر فی کس ڈھائی روپیہ محصول لگایا
جو داڑھی محصول کے نام سے وصول کیا جاتا تھا۔ فرائضی تحریک کے ایک کارکن، مولانا
نثار علی نے جو ٹیٹومیر کے لقب سے مشہور تھے۔ اب موضع سرفراز پور میں علم جہاد بلند کیا۔
لیکن کمتر قوت کی وجہ سے شکست کھائی، موضع کی مسجدیں اور مکانات جلا ڈالے گئے اسکے
بعد مولانا نثار علی عرف ٹیٹومیر اور ان کے ساتھ مولوی مسکین شاہ نے گوریلا جنگ شروع کردی۔
آخر ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجی دستے زمینداروں کی امداد کے لئے بڑھے اور مولانا نثار علی نے
بہادرانہ مقابلہ کے بعد جام شہادت نوش کیا۔

اس طرح مسلمانوں کی تحریک احیاء و اصلاح کو شروع ہی سے سامراج سے مقابلہ کرنا
پڑا سامراجی حملوں کا رُخ صرف مسلمانوں کے سیاسی اقتدار، انکی معاشی فلاح اور تجارت
کے خلاف ہی نہ تھا بلکہ وہ انکے مذہب پر بھی دست درازی کر رہے تھے۔ اسلامی مدرسوں
کو ختم کرنا، ان کا خاص مقصد تھا۔ کیونکہ انہی ذہنی مرکزوں سے سامراج کے مخالف
مجاہد پیدا ہوتے تھے۔ ان علمی مرکزوں میں ایک وسیع و یکساں نصاب رائج تھا جو
افراد کو مسلم معاشرے کے سانچے میں ڈھالتا تھا اور انکے دل و دماغ کو سامراج کیخلاف
تحریک کے لئے تیار کرتا تھا۔ بنگال سے انگریزوں نے اپنی مدرسہ شکن پالیسی کا آغاز کیا جہاں
اسی ہزار مدرسے تھے۔ ۱۸۳۷ء میں انگریزوں نے عربی فارسی تعلیم کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کیلئے

مدرسہ عالیہ کلکتہ قائم کیا یہاں نصاب تعلیم میں دینیات کی جگہ ادب وشعر کو ترجیح دی گئی تھی۔ اس طرح میں پادریوں کی سرگرمیاں بڑھنے لگیں اور وہ ہندوستان کو مرتد بنانے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کی امداد پانے لگے۔ ۱۸۳۵ء میں مسلمان اُمرا کے اوقاف کا سارا سرمایہ ضبط کرکے مذہبی مدرسوں کی جگہ انگریزی اسکولوں کو دیدیا گیا اور ۱۸۰۶ء سے قائم شدہ وقف ہگلی کی درس گاہ کو کالج بنا دیا گیا جس وقت مدرسہ کالج بنا تو اس کے تین سو طالب علموں میں سے صرف تین مسلمان تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضہ علاقوں میں ۱۸۳۲ء سے جو نظام تعلیم رائج کیا گیا تھا اس میں مسلمانوں کیلئے کوئی گنجائش نہ تھی اور خود سامراجی پالیسی بھی یہ تھی کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے بھی دور رکھا جائے اور قدیم تعلیم کے ذریعے بھی ان سے چھین لئے جائیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک مہم سب سے زیادہ ردعمل پیدا کرنے والی ثابت ہوئی یہ کمپنی کی طرف سے ہندوستان میں مسیحی تبلیغ کی پرزور کوشش تھی جو آگ لگانے لگی پادریوں کا طریقہ تبلیغ بہت جلد مناظرے میں بدل گیا کچھ تو مشرقی آداب زندگی سے ناواقفیت اور کچھ سپید فام نسل کی برتری کے غرور میں وہ ہندوٗں مسلمانوں کے مقدس بزرگوں کی توہین کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انکے اعتراضات کا جواب دینا جدید خیالات، سائنس اور مغربی دینیات کے مطالعے کے بغیر ممکن نہ تھا۔ معقولات و منقولات کے مشہور مسیحی فاضل ڈاکٹر فینڈر نے فارسی میں اپنی تصنیفات سے علماء کو حیرت زدہ کردیا اسنے دعویٰ کیا تھا کہ میں دس سال میں پورے ملک کا مذہب بدل دونگا مگر آگرہ میں جب اسکا مناظرہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں سے ہوا تو وہ شکست کھا کے ہندوستان سے چلا گیا ان دونوں نے مغربی دینیات اور سائنس کا مطالعہ

خاص مطالعہ کرکے پادری فینڈر کا مقابلہ کیا تھا یہ گویا علمار میں ماحول کے بدلنے سے علوم جدیدہ کی طرف توجہ کا پہلا نمونہ تھا۔

آگرہ کے انگریز حاکم، ولسن نے پادری فینڈر کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے ان علمار پر مقدمات قائم کئے جو تبلیغ کے میدان میں پیش پیش تھے۔ یہ ۱۸۴۷ء کا واقعہ ہے۔ مشہور مداح رسول مولانا غلام امام شہید (وفات ۱۸۷۶ء) مفتی انعام اللہ خاں گوپاموی مولانا کریم اللہ خاں صدر الصدور، مولانا قاسم داناپوری کے ہمراہ آگرہ کے کئی معزز علمار پر مقدمہ چلا ان لوگوں پر یہ بھی الزام تھا کہ انھوں نے مولوی احمد اللہ شاہ سے ساز باز کیا ہے جو اسی زمانے میں ہندوستان بھر کا دورہ کرکے انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے لوگوں کو منظم کر رہے تھے۔ آگرہ کے ان علمار کے خلاف یہ اقدام بہت مشہور ہوا اور اس نے ولسن گردی کے نام سے کہاوت بن کے لاکھوں دلوں کو کمپنی کے حکمرانوں سے شدید نفرت کا ایک نیا سبق دیا۔

ان علمار کو بعد میں مقدمے سے نجات ملی اور یہ سب خانہ نشین ہوگئے لیکن مولوی احمد اللہ شاہ دلاور جنگ کو کون روک سکتا تھا؟ ہندوستان کا مسلسل سفر اور اس گشت میں انکی انگریز حکمرانوں کے خلاف تبلیغ کا سلسلہ برابر جاری رہا اور زندگی کے آخری لمحے تک وہ اپنے مقصد کے لئے کام کرتے رہے (انکی شہادت غدر کی ناکامی کے بعد ۱۸۵۸ء میں ہوئی) ولسن گردی نے علمار کو بہر حال یہ فائدہ پہونچایا کہ وہ مغربی کتابوں کو پڑھنے کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔

مسلمانوں کو پوری طرح تباہ و برباد کرنے کے مقصد سے یہ کارروائیاں بڑی شدت سے عمل میں لائی جارہی تھیں اور مسلمان تباہ ہورہے تھے کہ اچانک غم و غصّے کی لہر ۱۸۵۷ء

کے ملک گیر ہنگامے کی شکل میں پھوٹ پڑی۔

○

۱۸۵۷ء میں فتحمند فریق: انگریزوں نے سارے ملک میں جی کھول کر مسلمانوں سے بدلہ لیا۔ انکی بین الاقوامی سیاست کا تقاضہ تھا کہ وہ مسلمانوں سے خوفزدہ رہتے کیونکہ لندن سے کلکتہ تک بحری راستوں پر سامراج کی رگ جاں ہر جگہ مسلمانوں کے نشتر کا شکار ہوتی رہتی تھی۔ انگریز مسلمانوں سے بہت بدگماں اور خوف زدہ تھے اور انکو ہونا چاہیے تھا۔ آخر یہ مسلمان ہی تو تھے جو بحیرہ روم میں انگریزی جہازوں کو مراکش والجزائر کے ساحل سے نکل کے شکار کرتے تھے اور ان جہازوں سے خراج لیتے تھے پھر عدن، حضرموت اور مسقط و عمان کے مسلمان تھے جنکی سلطنت افریقہ میں سمالی لینڈ، زنجبار اور مدغاسکر تک پھیلی ہوئی تھی اسلئے بحیرہ ہند میں بھی انگریزوں کو مسلمانوں کے آگے سر جھکانا اور انکو اپنا آقا تسلیم کرکے بحری خراج دینا پڑتا تھا۔ یہ ذلت و بے عزتی کا وہ سلسلہ تھا جسکو جان بل نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ شاید رچرڈ شیردل کا سلطان صلاح الدین ایوبی کے روبرو اپنی تلوار پھینک کے اظہار نامردی کرنا بھی انگریزوں کے ذہن سے کبھی نہیں نکلا۔
صنعتی نظام نے مشرق کو مغرب کے لوہے فولاد کے سامنے پگھلادیا تو انگریز مسلمانوں سے بدلہ لینے کے قابل ہوگئے۔ انکی توپوں نے پہلے مراکش والجزائر میں فرانسیسیوں اور اسپینیوں کی مدد کرکے مسلم اقتدار کو ختم کیا پھر خلیج فارس میں عمان و مسقط اور بحرین کے عرب حکمرانوں سے دوستی کے خلاف ناموں پر بالجبر دستخط لئے گئے۔ ۱۸۲۱ء میں مسقط کے سلطان نے اور ۱۸۳۲ء میں بحرین کے شیخ نے انگریزوں سے وعدہ کیا کہ ان پر بحری حملے بند کئے جائینگے۔ ۱۸۲۷ء میں بمبئی سے انگریز لشکر ہندوستانی سپاہیوں کو لے کے پہنچا اور

زبردست گولہ باری کے بعد عدن پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸۵۷ء میں سلطان عمان سے بحیرہ احمر کے کوریا موریا جزیرے اور جزیرہ پیرم حاصل کرکے انگریزوں نے بحری راستوں پر پورا تسلط کرلیا۔ یہ تسلط سن ستاون میں انگریزوں کی فوجی برتری کا اصل سبب تھا آخر انگریزوں کی ہمت یہاں تک بڑھ گئی کہ انھوں نے نجد و حجاز میں شریف مکہ کی آزاد سلطنت قائم کرنے کی ناکام سازش کی اور ناکامی کے بعد عربوں کو مرعوب کرنے کے لئے بندرگاہ جدّہ پر جو مکّے مدینے کے راستے کا دروازہ ہے ۱۸۵۸ء میں گولہ باری کرکے اسکو تباہ کردیا۔

اب تک انگریزوں کو وہابی تحریک کے کچلنے میں ترکی سلطنت کے غدّار وزیروں کی وجہ سے ترک لشکر اور مصری فوج کی امداد مل رہی تھی۔ لیکن جدہ پر بمباری اور شریف مکّہ سے سازش کے واقعے نے ترکوں کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے بڑی تیزی سے قدم اُٹھا کے ۱۸۷۲ء میں یمن پر قبضہ کرکے عدن کی انگریزی سرحد پر اپنے لشکر تعینات کردئے۔ خلیج فارس کے کناروں پر بھی ترکوں نے ۱۸۷۱ء میں الحسا کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ عربوں کو اُبھارکے ترکوں کے خلاف کھڑے کرنے کی سازش جاری تھی اسلئے ترکوں نے ۱۸۷۷ء میں مکّے و مدینے پر بھی اپنے گورنر مقرر کردئے اور مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی بین الاقوامی جدو جہد کو اس طرح کامیاب ہونے سے روک دیا۔ ورنہ حرمین شریفین پر انگریز نواز حکومت قائم ہوجاتی ۱۸۵۷ء ہندوستان کو پوری طرح انگریزوں کے قبضے میں دے چکا تھا اور انگریز اطمینان سے اپنے اقتدار کو بنانے اور سنوارنے میں لگے ہوئے تھے اور اب ان کے سامنے ہندستان میں ایک مستقل ملک گیر نظام کی تعمیر کا مسئلہ تھا کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ ہندستان پر براہ راست برطانوی تاج کی حکمرانی قائم کردی گئی تھی۔

اس نئے نظام میں بھی مسلمانوں کو کچلنے کی پالیسی خصوصیت سے جاری رہی اور اس کا خاص نشانہ علمائے اسلام کو اور ان میں بھی اصلاح و احیاء کے حامی علماء کو بنایا گیا چنانچہ وہابی مقدمات کا سلسلہ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۰ء تک جاری رہا جس میں پٹنہ کے خاندان صادق پور کے امیر کبیر مجاہد علماء: مولانا عبدالرحیم، مولانا یحیٰی علی اور مولانا احمد اللہ کو صوبہ سرحد کے مجاہدوں سے تعلق کے جرم میں حبس دوام کی سزائیں ملیں اور ان کے خاندان کا نام و نشان مٹا دیا گیا، گویا غدر میں مولوی احمد اللہ شاہ، منشی عظیم اللہ خاں، جنرل بخت خاں کی کاری ضربوں کا بدلہ بے بس مظلوموں سے چکایا گیا۔ اسی سختی کا اثر تھا کہ بہت سے علماء نے حکومت وقت کی خوشامد کے لئے وہابیوں کی مخالفت کو خواہ مخواہ اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ کیونکہ خاندان صادق پور کے بانی مولانا ولایت علی صاحب نے انگریزوں کی نظر میں سید احمد شہید کے جانشین کی حیثیت سے وہابی کا نام پایا تھا۔ خاندان صادق پور کی جدوجہد کو انگریزوں نے ختم کرنے میں اسلئے بھی جلدی کی کہ بنگال سے مدراس تک ان کے مبلغ عیسائی پادریوں سے مباحثے کرتے پھرتے تھے اور مسلمانوں کو اسلام کی حفاظت پر اُبھارتے تھے۔

○

تاج برطانیہ کے زیر سایہ ہندوستان میں مسلمانوں پر نامرادی، احساس شکست اور غم و غصے کے جذبات طاری تھے وہ حکومت کے احساس برتری، معاشی فراغت اور آزادی کے سکون سے محروم ہو چکے تھے حالات کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ ماحول سے کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کر کے جینے کی راہ نکالتے۔ انگریزوں کے عہد حکومت میں

تعلیم و ملازمت کے دروازے مغربی کنجیوں کے بغیر نہیں کھل سکتے تھے۔ مسلمانوں میں مذہبی جذبات کی فراوانی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ انگریز ان کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں یہ خیال ان کو جدید تعلیم کی طرف بڑھنے سے روکتا تھا دوسری طرف ملازمتوں کے لئے جو ہمیشہ مسلمانوں کا خاص پیشہ رہی تھیں انگریزی پڑھنا ضروری تھا یہ وہ قومی محرک تھا کہ آخر اس نے علمار کی اس مخالفت کو ٹھکرادیا جو جدید تعلیم کے خلاف دی گئی تھی۔ پھر بھی ایک واحد فرد: سید احمد خاں دہلوی نے اس مخالفت کا حصار توڑنے میں جو کام کیا وہ ایک معمولی شخص کے لئے غالباً ناممکن تھا۔

سید احمد خاں انیسویں صدی کے ماحول میں ڈھلے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو جدید مغربی علوم سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے تعلیم کے نصاب اور طریقے کو بدلنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ ۱۸۷۳ء میں علی گڑھ کالج کے قیام میں نکلا یہ تمام عالم اسلامی میں مسلمانوں کی وہ پہلی اور واحد درسگاہ تھی جہاں مغربی علوم، جدید نصاب اور نئے طریقۂ تعلیم کا غلغلہ تھا۔ اس بڑے تعلیمی ادارے کو اسکے بانی نے مسلمانوں کی تہذیبی اور ذہنی زندگی کے عروج کے لئے قائم کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں کہنگی و قدامت کے اثراتِ بد کا ازالہ جدید ترین خیالات کے سیلاب سے کیا جائے۔

سید احمد خاں نے دینیات کے مہمات مسائل پر بھی قلم اٹھایا اور عقل کی روشنی میں ایک نئے نظام عقاید کی تشکیل کرنی چاہی۔ اس سلسلے میں انھوں نے قرآن کی تاویلی تفسیر لکھی۔ تورات و انجیل کا جائزہ لیا، فقہ کے مختلف معاملات میں اجتہاد رائے ظاہر کیا۔ کٹرپن، علیحدگی پسندی اور جمود سے انکو سخت چڑ تھی۔ سید احمد خاں کی یہ جدید جدید

۱۸۶۶ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کے قیام اور ۱۸۷۰ء میں ایک علمی جریدے تہذیب الاخلاق کے اجراء سے اپنا اثر دکھانے لگی۔ اُردو میں علمی مضامین اور کتابوں کی اشاعت شروع ہوئی اور پڑھے لکھے طبقے میں غور و فکر کی صلاحیتوں کو اُجاگر ہونے کا موقع ملا۔ سید احمد خاں کی جدو جہد سے تمام ملک میں جگہ جگہ مکتب، مدرسے اور تعلیم گاہیں قائم ہونے لگی تھیں۔ اور ان میں اُردو اور انگریزی کی تعلیم کا خاص طور سے بندوبست کیا جانے لگا تھا۔ عربی فارسی سے توجہ ہٹنے کی وجہ سے اُردو نے بڑی ترقی کی اور ہندوستانی مسلمانوں کی خاص زبان بن کے اپنے آپکو دس کروڑ افراد کی ترجمان بنالیا۔

○

تحریک علی گڑھ کے ہمہ گیر اثرات نے ہندستانی مسلمانوں کو ہر شعبہ حیات میں بدلنا شروع کردیا تھا۔ ایک مرتبہ مغربی دنیا کے وسیع معلومات اور آزاد خیال کا چسکہ پڑنے کے بعد یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ تاریخ کے عمل کو روکا جا سکتا۔ علی گڑھ تحریک نے دل و دماغ بدل دیئے۔ لباس بدل دیئے۔ معاشرت اور تہذیب بدل دی اور بظاہر یہ نظر آنے لگا تھا کہ ہندوستانی مسلمان مغربیت کے سیلاب میں اپنا وجود اختصاصی بھی فراموش کردینگے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اسکی ایک بڑی وجہ تو مغربی تعلیم سے قومیت کے احساس کی بیداری ہے جس نے لوگوں کو پھر ماضی کی طرف واپس ڈھکیلا اور دوسرا سبب اسلامی تہذیب کے احیاء کے لئے دوسری تحریکوں کا اٹھ کھڑا ہونا ہے۔ یہ دیوبند اور ندوۃ العلماء کے مادّی پیکروں میں جلوہ گر تھیں۔ لیکن ان کی روح لامکاں تھی یا یوں کہئے کہ مسلم معاشرے کے ہر حصّے تک گرفت رکھنے والی یہ روح ملّت اسلامیہ کے ہر فرد کے اندر موجود تھی۔

○

دیوبند میں دارالعلوم کی بنیاد سنہ ۱۸۶۶ء میں پڑگئی تھی یہ علی گڑھ سے تقدم زمانی رکھتا تھا اسکی حیثیت درس، نظامیہ کی عام تعلیم گاہ کی نہ تھی بلکہ اس کے اندر ایک قوت اور بھی کام کررہی تھی یہ مولانا ابوالقاسم بانی دیوبند کی فکری توانائی تھی۔ وہ قدیم علوم کے متبحر عالم تھے اور دلی میں مولانا مملوک علی (وفات سنہ ۱۸۵۱ء) کے شاگرد رہ چکے تھے۔ متاخر علما میں مولانا مملوک علی اس لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں کہ اپنے مخصوص علوم قدیمہ کے ماسوا انکو مغربی علوم اور طرز تعلیم کا خاصا مشاہدہ تھا اور وہ انگریزوں کے قائم کئے ہوئے دلی کالج میں پروفیسر رہ چکے تھے، جہاں ذریعہ تعلیم اُردو تھی، معقولات کا ایک اصلاح یافتہ نصاب رائج تھا اور جسکی فضا میں مغرب اور مغربی علوم سے بے جا تعصب کی گنجائش نہیں تھی۔ دیوبند کے بانی کا ذہنی افق وسیع اور بلند تھا انھوں نے نصاب میں تو تبدیلی نہیں کی لیکن دیوبند کے طالب علموں کی ذہنی تربیت پر نمایاں توجہ دی وہاں معقولات کے قدیم ذخیرے کو جو انکشاف جدیدہ سے ناکارہ ہوچکا ہے، کبھی خصوصیت نہیں دی گئی۔ ساری توجہ قران و حدیث و فقہ کی سمت تھی۔ شاہ ولی اللہ کی فکر انگیز تصنیفات اور سید احمد شہید کی تحریک اصلاح سے وابستگی نے دیوبند کو ایک متحرک اور سرگرم مرکز بنا دیا یہاں سے جو عالم پیدا ہوئے انھوں نے خالص دینی شعبوں میں بڑا کام کیا۔ اصلاحی رنگ دیوبند پر ہمیشہ غالب رہا اور یہاں سے رسم پرستی کے خلاف جدوجہد کرنے والے بیشمار عالم نکلے جنھوں نے رسم پرستی کو ہٹا کے ملت اسلامیہ کو اس مرکزیت کی طرف کھینچا جو ہند ایرانی تہذیب یا ایرانی اسلامی تہذیب کے دور میں مقامی اثرات سے کمزور پڑگئی تھی۔ دیوبند عرب اسلامی تہذیب کا داعی، حامی و ناصر تھا اور ہے۔

دیوبند کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کو عرب اسلامی تہذیب کی طرف لیجانے کی کوشش

کرنے والا ایک طاقتور طبقہ عمل بالحدیث کے قایل علمار کا تھا۔ یہ ہندوستان میں اہل حدیث
کے نام سے مشہور ہوئے، انکی جد و جہد کا مقصد مسلمانوں کو فکر و عمل کے لحاظ سے اسلام
کے اوّلیں دور کے اقدار کی طرف لے جانا تھا اسی لئے یہ قیاس و اجتہاد کو ناپسند و مسترد
کرتے تھے۔ اہل حدیث علمار میں حضرت مولانا نذیر حسین محدث دہلوی (وفات سنہ ۱۹۰۲ء)
کے ارد گرد شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ جمع ہوا اور انکی تعلیم و تدریس سے بکثرت عالم پیدا
ہوئے اہل حدیث کے افکار کی علمی ترجمانی نواب صدیق حسن خاں بھوپال (وفات سنہ ۱۸۹۰ء)
کی کثیر کتابوں کی مرہون منت ہے انھوں نے اپنی جماعت کے نظریے کو بڑی قوت اور
وقار سے پھیلانے کی کوشش کی اور حدیث کے مختلف علمی شعبوں سے متعلق اہم اور نایاب
کتابوں کے ترجمے اور اشاعت کا سلسلہ قائم کیا۔

مغربی خیالات کے خیر مقدم کرنے والوں میں مولانا شبلی پیش پیش تھے، سید احمد خاں کے
رفیق خاص اور علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت میں انھوں نے جدیدیت کو ذہنی
طور پر قبول کرلیا۔ اس جدیدیت کا استعمال انھوں نے ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلمار کی مجلس
قائم کرکے کیا۔ جس میں مختلف خیال کے علمار شامل تھے ان علمار میں اس بات پر اتفاق
رائے تھا کہ علوم اسلام کی تعلیم کے لئے پرانا نصاب ناکارہ ہوچکا ہے اور اب اسلامی مدرسوں
میں قرآن و حدیث و فقہ کے پہلو بہ پہلو مغربی علوم پڑھانے کی ضرورت ہے چنانچہ اس مقصد
کو سامنے رکھ کر ۱۸۹۸ء میں ندوۃ العلمار کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس علمی مرکز کا رجحان بھی
یہی تھا کہ عرب اسلامی تہذیب کی طرف رجوع کیا جائے اور نصاب سے وہ کتابیں بالکل خارج
رکھی جائیں جو عرب اسلامی تہذیب کے زوال کے بعد لکھی گئی ہیں اور درس نظامیہ کا جزو اعظم

ہیں۔ ندوے میں مخلوط اور گنجلک نصاب کی جگہ متناسب نصاب رائج کیا گیا تھا عربی زبان، تاریخ اور ادبیات پر خصوصیت سے توجہ دی جاتی تھی۔ اور ندوۃ العلما سے عربی زبانوں اور ادب کے ماہر علمار کا ایک بڑا گروہ پیدا ہوا جو فکر و خیال کے اعتبار سے بھی زمانہ جدید کے تقاضوں سے باخبر تھا۔

ندوے کی تحریک کا بڑا کارنامہ مولانا شبلی کے قائم کردہ دار المصنفین نے دکھایا اس علمی ادارے نے تاریخ و تہذیب کے اسلامی شعبوں کے متعلق تحقیقی اور۔ اور مستند کتابوں کی اشاعت کی۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ندوۃ کی تحریک کے اثر نے دینیات کے ان نئے اسالیب سے روشناس کیا جن کی بنیاد عقیدت پر نہیں عقل پر رکھی جاتی ہے اس اثر نے اسلامی ادبیات کو شگفتہ اور تازہ کردیا۔ مولانا شبلی (وفات ۱۹۱۴ء) اور انکے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی (وفات ۱۹۵۲ء) نے رسول اللہ کی سیرت پر مستند تحقیقی کتابوں کا ایک قابل احترام سلسلہ لکھ کے اسلامی ادبیات میں نیا علمی معیار اور پُر تاثیر جدت پیدا کردی۔ یہ اسلامیات کے مطالعہ اور اُس کے ارتقا میں ہندوستانی مسلمانوں کا عظیم ترین کارنامہ ہے جس کی مثال نہ مغربی ممالک کے مستشرقین کے پاس ہے نہ خود ہمارے سابقے تحریری سرمائے میں نہ اسلامی دنیا کے یہاں ہے۔

آثارِ حیات

اسلامی تہذیب کے زمانہ عروج میں ذہنی ارتقا کا بہت بڑا سبب وہ قانونِ فکر تھا جسکی صداقت تفسیر، حدیث، فقہ، ہندسہ، ہیئت، طب ہر شعبہ علم میں تسلیم کی جاتی رہی یہ استقرا: معلوم سے غیر معلوم کا تصور و تعین کرنے کا طریقہ تھا جو مسلمانوں کے علمی مشاہدوں، تجربوں، تلاش و تحقیق کی توانائی بنا ہوا تھا اسی نے قیاس و درایت، اجماع و اجتہاد بن کے اسلامی تہذیب کی تعمیر کی، اسکی حفاظت کی اور اس کے لئے جارحانہ معرکے بھی کئے۔ دنیا کو روشنی کے سیلاب تک کھینچ لانے میں مسلمانوں کا جتنا بھی حصہ رہا ہے وہ اسی کا مرہون منت ہے یہ اصول فکر اسلامی تہذیب کے رگ و ریشہ میں پیوست ہوگیا اور اس کا اثر ابتک اسلامی تہذیب کے ہر گوشے، ہر حصے پر بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

آج بھی جب اسلامی تہذیب کو ایک کُل کی حیثیت میں مستقبل کا سامنا کرنا

ہے، اس کل کے ہر جزء میں حرکت و عمل کی ساری قوت اسی قانون فکر کی عطا کی ہوئی نظر آتی ہے، دنیا بھر کے مسلمان ماحول و حالات کے اختلاف کے باوجود اپنے حالیہ مسایل کا یکساں تجزیہ کرتے ہیں، انکا ردعمل یکساں ہے۔ وہ مسائل کے کا حل ماضی کی روشنی میں نکالنے کی جدوجہد کر رہے ہیں یہ وہی روح ہے جو اسلامی تہذیب کے عروج کے زمانے میں ان میں جلوہ گر تھی آج بھی انکو مسائل کے تجزیے اور انکے حل کرنے کا مقصد کا پورا علم ہے۔ منزل ایک ہی ہے۔ اب استقرا: معلوم سے غیر معلوم کے تصور اور تعین کا صرف آخری حصہ باقی رہ جاتا ہے یعنی غیر معلوم کا تعین و تصور، یہ غیر معلوم چیز مستقبل ہے۔ اسلامی تہذیب کی حرکت اور انکی قوت عمل اس غیر معلوم کو بہرحال معلوم و موجود کرے گی۔

مسلمانوں کا مستقبل انکے ماضی کے نمونے پر تعمیر ہو رہا ہے انکی جدوجہد کے رخ سامنے کی سمت ہیں لیکن انکی مدد ماضی سے آنے والی قوت کر رہی ہے۔ وہ سخت مخالف حالات سے دوچار ہیں مگر انکو مسایل اور انکی پیچیدگیوں کا علم ہے اور اپنے ماضی کا علم ہے اس لئے یہ کہنا ذرا بھی مشکل نہیں کہ مستقبل کیا ہوگا؟

○

مستقبل کی تعمیر میں سب سے اہم کردار عربوں کو ادا کرنا ہے۔ انہی کے علاقے اسلامی تہذیب کے اوّلیں اور سب سے بڑے مرکز تھے۔ انکی زبان میں علم و معلومات کا جو سرمایہ ہے وہ سرتاسر اسلامی تہذیب کا ہے وہ مسلمانوں کے سب سے پہلے فکری رہنما تھے اور آج بھی ان کے لئے قیادت کی یہ مسند خالی ہے انکی اس مقدّس جگہ پر غرناطہ و بغداد کی تباہی کے بعد افریقہ کے بربروں،

ایشیائے کوچک کے تورکوں اور ماوراء النہر کے مغلوں نے اپنے قدم رکھے لیکن ان تینوں میں سے کوئی اسلامی تہذیب کو جلال و جمال کے خوشگوار تناسب سمیت برقرار نہ رکھ سکا یہ تو عربوں ہی کا کمال، انہی کا حصہ تھا کہ وہ عالمگیر حکومتوں کے دارالسلطنت بھی بساتے تھے اور ان شہروں کو علم کے مرکز اور روشنی کے مینار بھی بناتے تھے۔

عرب اسلامی تہذیب کا زمانہ قوت و توانائی کا زمانہ بھی تھا کہ جہاں عرب پہونچے انھوں نے زمین و آسمان اپنے رنگ میں رنگ لئے اور ان کا زمانہ حسن و خوبی کا زمانہ بھی تھا کہ ان ہی کے زمانے میں فن تعمیر، تجارت، صنعت و حرفت، ادبیات، تاریخ، قانون اور اطلاقی علوم: طب، فلکیات، طبیعیات و کیمیا نے قرون وسطیٰ کے اندھیروں میں انسان کے لئے حیات وارتقاء کی شاہراہ تعمیر کردی تھی یہ عرب تھے جنھوں نے ایشیا اور افریقہ کو استقلال حیات دیا اور وہ تہذیبی بنیاد عطا کی جس سے بابل و نینوا، مصر و فونیقیہ اصطخر و گندھرا کے نابود ہوجانے والے لوگ محروم جئے اور محروم مرے تھے۔ عربوں نے ان دونوں براعظموں کو دوام و قیام کی لذت سے آشنا کیا یہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔

عربوں کو پھر یہی کرنا ہے وہ مراکش کے شہروں میں علم و عمل کی مشعلیں جلائیں بس کافی ہے پھر ملایا تک کرۂ زمین کا وسطی حصہ انکی پیروی کے لئے تیار و آمادہ ہے کیونکہ ایشیا و افریقہ کے لئے نصف سے زیادہ حصے میں امت وسطیٰ بستی ہے جس کے لئے عربوں کی آواز میں گہری، روحانی کشش ہے وہ عربوں کی زبان انکے فکر و نظر، انکے معیار حیات کو اپنے لئے آخری معیار تسلیم کرتی ہے بشرطیکہ عرب اپنے آپ کو اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے تیار کریں۔ سابقہ جلال و جمال کے حصول کا واحد راستہ

عربوں کے لیے یہی ہے۔ جو صدی گزر رہی ہے اس میں عربوں نے اس بڑی صداقت کو جان لیا ہے کہ ان کو دوسروں سے لینا بہت کم ہے اور انکو دینا بہت کچھ ہے۔ مغربی سامراج نے ان کی صفوں میں اپنے تہذیبی اثرات پہونچا کے انکو منتشر کرنا چاہا تھا۔ عربوں نے ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں مغرب کا فریب کھا کے قومیت کا زہر پیا لیکن زہر کے بدن میں پھیلنے سے پہلے انکو احساس ہوگیا کہ ان کا کام عرب قومیت کی پرستش کرنا نہیں ہے بلکہ عرب تہذیب کو زندہ کرنا ہے جو اسلام کی تہذیب تھی یہی وجہ ہے کہ عرب قوم پرستی کا رخ دن بدن سامراج کے خلاف ہوتا گیا اور اتنی ہی تیزی سے انھوں نے اپنے قدیم تہذیبی سرمائے پر پھر قبضے کی کوشش کی۔

احیار کی یہ لہر ہمہ گیر ہے۔ عام فکر و عمل کے ہر شعبے میں اس نے زبردست حرکت و تبدیلی کا سلسلہ قائم کیا ہے اسکے نمایاں اثرات عربی زبان کے جدید ارتقا میں ملتے ہیں جو عرب تہذیب و سلطنت کے زوال کے بعد عرصے تک انحطاط کا شکار رہی تھی حکومت سے محروم ہو کے اس نے بہت بُرے دن دیکھے۔ عجمی تسلط نے اسکو نظم و نسق سے ہٹایا اور علمی مرکزوں میں اسکی حیثیت کم کردی تھی۔ اسکی تعلیم و تدریس عجمی علاقوں میں بھی صرف خالص مذہبی اغراض کے لئے کی جاتی تھی۔ خود عرب علاقوں میں اس کا معیار گر گیا تھا۔ علمائے متقدمین کی کتابوں کی جگہ متاخرین علما کے حاشئے، شرحیں اور منتخبات رائج ہو گئے تھے۔ عرب شہروں کی تباہی نے بڑے علمی مرکز نابود کردئے تھے، کتب خانے تباہ ہو چکے تھے اور وہ فکری سرمایہ جو اسلامی تہذیب کے آغاز و عروج میں عرب علمار نے جمع کیا تھا بظاہر گم نظر آتا تھا۔ ان

قدیم کتابوں کی کمیابی نے عرب علاقوں سے لے کر عجمی علاقوں تک ہر جگہ تاریخ، لسانیات تفسیر و حدیث کا معیار بہت پست کر دیا تھا۔ عجمی تہذیب و سلطنت کے زمانوں میں وہ زبان جس نے صدیوں تک علم و معمولات کے نئے مرحلوں کا ساتھ دیا۔ نئی کتابوں اور فکر جدید سے محروم ہو گئی تھی اس کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ یہ کئی مقامی بولیوں میں بٹنے لگی اور عربی بولنے اور پڑھنے والے جو کسی زمانے میں اکتشافات علمی کے مستند اور جدید ترین حقائق کے علم بردار ہوتے تھے آخر محض چبائے ہوئے نوالوں کو اگلنے لگے تھے۔ سب سے زیادہ نقصان قانونی ادبیات کے عظیم الشان ذخیرے سے محرومی نے پہونچایا اس زبردست قوت: فقہ اسلامی نے اپنے اصول و قواعد قانون سازی کا سارا خزانہ اموی و عباسی سلطنت اور اسکے بعد بھی عربی مخطوطات میں منتقل کیا تھا، عربی کے زوال نے صدہا بیش بہا کتابوں کو نایاب بنا کے عربوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً مفلس بنا دیا تھا۔ کسی تہذیب کی ناتوانی یا قوت کا پتہ چلانے کے لئے زبان ہی کی نبض دیکھی جاتی ہے۔ عربی کا یہ انحطاط اسلامی تہذیب کے انحطاط کا سب سے بڑا ثبوت اور اسلامی تہذیب کے زوال کی بہت نمایاں علامت تھا۔

پچھلی صدی کے آخر سے عربی زبان نے دفعتاً کروٹ بدلی۔ لوہے کے حروف اور چھاپے خانے نے صدہا قدیم علمی خزانوں کو کتب خانوں سے نکال کے عام کر دیا۔ مغربی مستشرقین نے تاریخ، شعر و ادب، قانون، لسانیات کے نوادرات شائع کرنے کا مبارک سلسلہ شروع کیا تھا، اسکی پیروی تیزی سے بیروت، بولاق، قاہرہ، دمشق کے علاوہ قسطنطنیہ، کلکتہ، لکھنؤ، دلی، حیدر آباد دکن، بمبئی، جیسے غیر عرب شہروں اور خود برلن، لپزگ، لیڈن، لندن، میڈرڈ، میلاں، پیٹرسبرگ، کراکو جیسے مغربی

شہروں میں ہونے لگی۔ قدیم مصنفین اور انکی کتابوں کی عام اشاعت نے ذہن و فکر کے راستے کھولے اور اسلامیات کے وسیع مطالعہ کا نیا میدان فراہم کیا۔ مقامی بولیوں، لب و لہجہ اور تلفظ کے فرق باقی رہے۔ لیکن عہد قدیم کی طرح علمی اور تحریری زبان وہی قرار پائی جس کو قرآن نے لسان المبین کہا ہے یہ قرآن کی کلاسیکل عربی ہے اور یہی بین الاسلامی زبان ہے۔

عرب علاقوں سے ترکی اقتدار کے خاتمے نے عربی کو آگے بڑھنے کا اور موقعہ دیا۔ نظم و نسق، تعلیمی نظام اور صحافت کی ترقی نے زبان کو مستحکم اور اس کے مستند کلاسیکل اسلوب کو عام کرنے میں بیش از بیش حصّہ لیا۔ شعر و ادب میں مغربی ادبیات عالیہ سے استفادہ شروع ہوا فلسفے اور سائنس صدیوں تک عربی ہی بولتے رہے تھے، نہ قدیم علمی اصطلاحوں کی کمی تھی نہ ذخیرہ الفاظ کی وسعت اور لفظ سازی کے عربی اصول و قواعد ایسے کمتر تھے کہ علم و فن کی جدید صلاحیتوں کا احاطہ نہ کر سکتے اب عربی زبان کو پھر وہی تاریخی فریضہ ادا کرنے کا موقعہ ملا جو ماضی میں اُس نے اشاعت علمیہ کے لئے ادا کیا تھا۔

عرب اسلامی تہذیب کی تاریخ میں روشن خیالی اور فکر و نظر کی بلندیوں کو عربی زبان سے منسوب کئے بغیر چارہ نہیں۔ گرم و خشک صحراؤں کے یہ باشندے حوصلے کی فراخی، ذہن کی کشادگی، دل کی کھلی ہوئی کھڑکیوں کے مالک تھے۔ جب تک اسلامی تہذیب کی قیادت عربوں کے ذمے رہی اس میں جمود و زوال پیدا نہیں ہوئے انکے قومی خصائص نے عربوں کو جس سانچے میں ڈھالا تھا وہ انسانیت کے مرتبۂ کمال کا بہترین سانچہ تھا جو چیز اُنکو سب سے زیادہ ممتاز و نمایاں کرتی ہے وہ انکا ذوق

تجسس تھا۔ یونان و روم کے فلسفے و منطق، ہندوستانی طب و نجوم مصری فلکیات و ہیئت، سب سے انھوں نے کھلے دل سے استفادہ کیا، انکو مزید ترقی دی اور ہر صدی میں ان کا ذہن اطلاقی علوم کی تشکیل جدید اور معلومات کے ذخیروں میں اضافے کرنے میں لگا رہا۔ وہ علم کے شیدائی اور عمل کے دیوانے تھے۔ کج روی اور کج نظری سے انکو خدا واسطے کا بیر تھا اور وہ ہر چیز کو صفائی، سادگی، ترتیب سے بنانے اور برتنے کی کوشش کرتے تھے، انکے مزاج میں لطافت اور لچک تھی، تعصب اور تنگ دلی سے وہ کوسوں دور تھے۔ یہ حقائق اعلان کرتے ہیں کہ عربوں میں علم کی سچی پیاس تھی اسی لئے وہ تقلید اور اندھے یقین سے بالاتر تھے۔ انھوں نے دین و دنیا کے معاملات کو سلجھاتے وقت ہمیشہ تین انقلابی اصول: درایت، قیاس، اجتہاد استعمال کئے، درایت کے ذریعے روایات مذہب کو، قیاس کے ذریعے اصول زندگی کو، اور اجتہاد کے ذریعے سماجی قانون کو انھوں نے جانچنے، پرکھنے اور نئے سانچوں میں ڈھالنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان پر زوال آیا تو یہ تینوں انقلابی اصول بھی اپنی قوت کھو بیٹھے، اب عرب اسلامی تہذیب کا احیار ان انقلابی اصولوں کو پھر سے زندہ کر کے روشن خیالی اور وسیع النظری کا نیا دور شروع کرنے والا ہے، عرب علاقوں میں اس کی داغ بیل پڑ چکی اور غیر عرب مسلمانوں تک حرکت و عمل کا یہ پیام پہونچ رہا ہے ایک متحدہ عرب جمہوریت کا قیام سیاسی میدان میں اور عربی زبان کا ارتقار تہذیبی میدان میں: دونوں حرکت و عمل کے پیامبر ہیں جن کا میدان عمل جدا جدا مگر مقصد ایک ہی ہے اور وہ ہے: اسلامی تہذیب کی عالمگیر نشاۃ ثانیہ

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الہ اللہ

○

عربوں کی اس نئی قوت نے تمام مسلم ملکوں میں احیاء و اصلاح کی تحریکوں کو آگے بڑھنے میں مدد دی ہے۔ ترکی، ایران، افغانستان، انڈونیشیا، ملایا میں جہاں مغربی قوم پرستی نے کچھ عرصے کے لئے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا، اب ان ملکوں میں قوم پرستی کا مخالف اسلام رویہ باقی نہیں رہا بلکہ یہ اپنے قومی ماضی کے اس دور کو مثالی معیار تسلیم کرتے ہیں جب انکی سرزمینوں پر اسلام کی آمد آمد نے تمدن و تہذیب کے نئے اسالیب تعمیر کئے تھے۔

مسلم ممالک کے لئے یہ تبدیلی دور رس اثرات کی حامل ہے۔ مغربی قوم پرستی کے نمودار ہونے سے بہت پہلے ہی ان ملکوں میں بین الاسلامی تصور حیات مقامی روایات کے نشو و نما کے آگے کمزور پڑ گیا تھا۔ الہیات، قانون اور تصوّف نے تنگ قومی ماحول و فضا میں اس طرح ترقی کی تھی کہ ان کا تعلق اسلام کے ابتدائی، سادہ اور بنیادی اصول و ضوابط سے ختم ہو چکا تھا، یہ تضاد خصوصیت سے عقاید، قانون، تصوّف اور شعر و ادب کے شعبوں میں نمایاں تھا۔ ان تمام ممالک میں مسلم ذہن پر عجمی افکار نے غلبہ پا لیا تھا۔ عربوں کی وسعت فکر، روشن خیالی اور مشاہدے و تجربے کی روح سے یہ غیر عرب تمدن محروم تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دینیات کے شعبے میں اجتہاد و قیاس کی جگہ جامد تقلید اور تنگ نظری نے لے لی۔ اور نت نئے مسائل زندگی کے روبرو، جنکا عمرانی ارتقا میں سامنے آنا فطری بات تھا ان ملکوں کی دینیات کو اپنی بے بسی کا اعتراف کرنا پڑا اس نے یا تو تنگ نظری سے کام لیا اور عوام سے دور ہو گئی یا پھر اسنے سماجی اقتدار

سے نظر چرا کے مخالف حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ یہ چیز رفتہ رفتہ اسلامی تہذیب کو کمزور کرتی گئی۔

تجربے اور تحقیق کے عربی ذوق کے خاتمے نے علوم و فنون پر موت کی سردی طاری کردی۔ عرب علمار کی کتابیں ان کے تجربی علم کی بیاضیں ہوا کرتی تھیں۔ ان عجمی تمدّنوں میں نصابی کتابوں کی لفظی پیروی کی جانے لگی۔ علم نے عمل سے محروم ہو کے انحطاط کو اپنا مقصد بنا لیا تھا۔ سماجی زندگی میں مزید خرابیاں اسلام کے معیار مساوات اور تصوّر ملّت سے دوری نے پیدا کردی تھیں۔ ایشیائی طرز حکومت اور سلطنت میں بعض طبقوں کو نسلی اور خاندانی امتیاز حاصل ہوتے ہیں اور انسانیت کو پست، متوسط، بلند: تین مستقل ٹکڑوں میں بٹا ہوا تسلیم کیا جاتا ہے یہ ایشیائی روایت بھی ان عجمی تمدّنوں میں پوری شدّت سے موجود تھی۔ اور مجموعی قوت کو مسلسل کمزور بناتی رہی یہاں تک کہ مغربی سامراج نے ان تمدنوں کے علاقوں کو استحصال و استعمار کے لئے استعمال کرنا شروع کیا اور انکو اپنے تمدّن و تہذیب کے گہرے نقائص و عیب نظر آنے لگے۔

مغربی سامراج کے خلاف جو رد عمل پیدا ہوا وہ بھی مقامی تضاد اور قومی ماحول کی پرستش پر زور دیتا تھا۔ صنعتی تہذیب، مادیت اور مغربی فکر نے ان ممالک میں قوم پرستی کی روایت کو جنم دیا جسکی اساس نسل و خون کے دائرے میں محدود ذہنی حرکت پر تھی، اسکی وجہ سے لاطینی رسم خط کے استعمال، مغربی ملبوس و معاشرت کے رواج، جنسی آزادی اور آثار قدیمہ کی پرستش کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ ترکی، ایران اور افغانستان میں قومی زبانوں سے عربی کے الفاظ خارج کرنے اور

اپنے ملک وقوم کے اس عہد کی سمت واپس لوٹنے کے جذبے پرورش پانے لگے جوان علاقوں میں اسلام کی آمد آمد سے پہلے کا انحطاط پذیر زمانہ تھا لیکن بہت جلد یہ اندازہ ہونے لگا کہ قبل از اسلام کے قومی تمدن و تاریخ سے فکر و ذہن کا کوئی سرمایہ، کوئی روایت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ان علاقوں کے سارے تہذیبی ورثے عرب اسلامی تہذیب کے نقش پا کی پیروی کرتے ہیں۔ اس صداقت کے اعتراف میں کچھ دیر لگائی گئی لیکن بہر حال اسکو ایک ناقابل انکار حقیقت تسلیم کرنا پڑا۔

اپنے ماضی کے اسلامی ورثے کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے بعد ان عجمی علاقوں میں اصلاح و احیار کی پر زور تحریکوں کا نیا سلسلہ شروع ہوا جنکے اثرات علمی حلقوں کے معیار فکر کو بدلنے لگے اور ان حلقوں میں جستجو کا مرکز اسلامی تہذیب کا وہ حقیقی وجود بن گیا جو عجمی تمدنوں کے خس و خاشاک میں پنہاں تھا لیکن اسی کی وجہ سے یہ قومی تمدن و تہذیب پھلے پھولے تھے۔ اسکی سمت متوجہ ہونے کے معنی یہ تھے کہ عربی علوم کے مستند ذخیروں کی طرف رجوع کیا جائے اور ان کی کسوٹی پر اپنی جدید و قدیم اقدار حیات کو جانچا پرکھا جائے۔

○

ذہنی بیداری نے سب سے پہلے تاریخ اسلام کے معروضی مطالعے کی ابتدا کی۔ عربی نشاۃ ثانیہ نے تاریخ کے ان بے شمار اسناد کو عام کر دیا تھا جو اس سے پہلے قلمی کتابوں کی شکل میں نایاب تھیں۔ ان کی عدم موجودگی میں تاریخ اسلام محض افراد کے عروج و زوال اور حکومتوں کی تبدیلیوں کی کہانی تھی۔ عہد قدیم کے

بارے میں تصورات گمراہ اور دھندلے تھے۔ عربی تاریخوں کے معروضی مطالعے نے اسلامی تہذیب کے رنگ وروپ کی وضاحت کی۔ خلافت اسلامیہ کے طرز حکومت، نظم ونسق، مالیات، نظام تعلیم، اسکی سرپرستی میں پھلنے والے علم وفن، صنعتیں، بین الاقوامی تجارت اور تہذیبی لین دین کے بارے میں جو مفصل معلومات ان قدیم تاریخوں کی طباعت اور اسکے تحلیلی جائزے سے حاصل ہوسکیں انھوں نے اعتماد ویقین کو نئے سہارے دیے اور درایت کے اصول کو پھر سے عام کیا، درایت کے استعمال نے حالیہ مسائل کے متعلق بہت سے نظائر اور ضوابط خلافت اسلامیہ کے مختلف ادوار سے فراہم کئے اور اسلامی تہذیب کے بارے میں سابقہ تنگ نظر تصور کی گرفت کمزور کر کے تعمیر نو کے لئے روشن ترین زمانہ ماضی سے معیار اور مثالی نمونے پیش کئے۔

اسلامی قانون: فقہ کو ہر زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی اسلامی معاشرے اور اسکے افراد کے انفرادی اور اجتماعی معاملات کی رہنمائی کرنا تھی عجمی تمدنوں کے تحت ایک طرف تو اسلامی قانون ایشیائی بادشاہت کے ماتحت، محدود دائرے میں بند رہا تھا دوسری طرف اسکے ارتقا کا سلسلہ قیاس و اجتہاد کے معدوم ہونے کی وجہ سے بند ہوگیا تھا اصول قانون کے مطالعے اور فقہ کے علمی تجزیے کی جگہ تیسرے درجے کی فتویٰ نویسی اور قانونی کتابوں کی شرح نویسی رائج ہوگئی تھی۔ قانون کے میدان میں نظری اختلافات برداشت نہیں کئے جاتے تھے اور قانون جیسی لچک دار، قیاسی ضابطہ بندی کو احکامات قرآن کی طرح ناقابل تنسیخ، غیر مبدل قرار دیا جاتا تھا اور فروعی اختلافات بھی تکفیر کرنے کے لئے معقول

اور اہم اسباب کی فہرست میں شامل ہو گئے تھے۔

عجمی تمدنوں کے بدترین ذہنی انحطاط اور پستیٔ فکر کا مظاہرہ عقاید و الٰہیات کے شعبوں میں نظر آتا ہے یہ دونوں عربوں کے تحلیلی اور تجرباتی ذہن نے پیدا کئے تھے۔ عربوں نے یونانی فلسفے اور منطق کے علم بڑے شوق سے حاصل کئے تھے اور ان کو ہوشیاری سے فکر و تخیل کے بنیادی قانون دریافت کرنے کے لئے برتا تھا عرب اسلامی تہذیب میں تجربی علم کی برتری کا لازمی تقاضہ تھا کہ وہ کائنات کا وسیع علمی تصور قائم کرتے اور حقائق اشیاء کے بارے میں گہری چھان بین سے کام لیتے۔ ان کے اس رویے نے علم عقاید کو جنم دیا تھا جو کائنات، وجود خداوندی معیار خیر و شر اور بہت سے مجرد تصورات کی تعریف اور درجہ بندی کا نام تھا۔ عجمی تمدّنوں میں عقاید کے علم نے واہمہ پرستی کی شکل اختیار کرلی۔ ان مسائل کو جن کی اہمیت اور حقیقت الفاظ کے محتاط استعمال کے بغیر سمجھ میں نہیں آتی عربوں نے ہمیشہ بڑی سادہ، عام فہم اور منطقی زبان میں بیان کیا تھا اور اسی وجہ سے عرب اسلامی تہذیب کے دور میں فلسفے نے الٰہیات بن کے عقاید کی صورت کبھی نہیں اختیار کی۔ عجمی تمدّنوں میں عقاید و الٰہیات کو ایک کردیا گیا۔ انکے یہاں ان کا اظہار ایک پراسرار، مغلق اور شخصی اصطلاحات سے بھری ہوئی زبان میں کیا جانے لگا ان اصطلاحات کو ایک نسل کے بعد دوسری نسل نے کچھ کا کچھ سمجھا اور اسلامی فلسفے کے بنیادی مسائل نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اسلام کے بنیادی اصولوں اور عقاید میں موشگافیوں نے اس کے نظام عمل کو کمزور، سست اور مضمحل بنادیا۔

عجمی تمدنوں میں تصوف نے اس بگڑے ہوئے فلسفے عقاید اور الٰہیات کی الجھنوں اور خامکاریوں کو عام کرنے میں سب سے بڑا کردار ادا کیا عرب صوفیوں نے فکر و نظر کی سادگی کو اپنا طرز فکر بنایا تھا، ان بگڑے ہوئے تمدنوں کے عجمی صوفیوں نے فکر و نظر کی تہ در تہ پیچیدگیوں، اسرار، تخیل کے غیر منطقی استعمال اور زبان کے شاعرانہ اسلوب کو اپنایا۔ عجمی تصوف نے اسی زمانے میں ایسی ذہنی تحریکوں کو پھیلایا جو فلسفے کے مسلک تشکیک کی طرح مذبذب بھی تھیں اور عہد جاہلیت کے بت پرستوں کی طرح اندھی پیروی اور تحقیق و علم کی دشمن بھی تھیں۔ ان تحریکوں نے مسلمات کو شک و شبہ میں بدل دیا لیکن خود کوئی مفروضہ تک قائم نہ کر سکیں انکا سارا زور دروں بینی پر تھا اور ان کے نزدیک ذاتی تجربے اور یقین کو اجتماعی علم اور تجربے پر فوقیت اور ترجیح حاصل تھی۔ ظاہر ہے کہ ان ساری گمراہیوں اور انتشار کی قوتوں کو عرب اسلامی تہذیب کے زوال نے جینے اور بڑھنے کا موقعہ دیا تھا اسکی زندگی کی نئی لہر انکی موت ثابت ہوگی۔

○

تہذیبوں کی تقدیر عزم و ارادے سے بنتی اور فکر و عمل سے تعمیر ہوتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ کی تحریک نے اس وقت جو یکرنگی اور ہم آہنگی کی ذہنی فضا پیدا کر دی ہے جو ماضی کے پُر اعتماد جائزے، حال کے پُر سکون تجزئے اور مستقبل کی مکمل تعمیر کے جذبوں، احساس اور عزم و ارادے سے مالا مال ہے۔ قوت اور توانائی کی یہ تہ در تہ لہریں عالم اسلامی کے ظاہر و باطن کو مسلسل بڑی شدت سے

بدل رہی ہیں۔ ان تبدیلیوں کا رُخ یکسانی کی منزل بعید کی سمت ہے لیکن عالمی تاریخ میں تہذیبوں کی عمر کا پیمانہ صدیوں ہی میں کیا جاتا ہے جو ہونے والا ہے، وہ بالآخر ہوگا چاہے افراد کی بے مایہ عمر اسے دیکھ نہ سکے اور ساری خوش نصیبی آنے والی نسلوں کے نام ہی لکھی جائے۔

اسلامیات کی تشکیل جدید کا راز اسی فلسفہ میں پوشیدہ ہے جسے حکیم الامت محمد اقبالؒ نے پیش کیا تھا۔

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر
جو کریگا امتیاز رنگ و خون مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

نشاۃ ثانیہ کا خواب دیکھنے والے ہر مفکر، کارکن اور رہنما کو یہ نصیحت کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کے بغیر بہتری کی کوئی توقع نہیں اور اصل اہمیت خاموش، تعمیری تحریکوں کی ہے جو ملّت اسلامیہ کو متحد و منظم کریں اور اسکو شعور و احساس کی بلندی عطا کریں۔

وما علینا الا البلاغ

کتابیات

مطالعہ اسلامیات کا مقصد اسلام کے مختلف اجزار کی ہمہ جہتی تاریخ، انکے ارتقا اور ان کی وحدت کا ایسا جائزہ لینا ہے جس سے اسلامی تہذیب کے ذہنی اور عملی کارنامے کھل کے سامنے آجائیں۔ توسیع سلطنت، نظام حکمرانی، قانون عامہ، دینیات اور اجتماعی فکر کے بارے میں جنھوں نے قرون وسطےٰ کی تاریخ کو منوّر و مجلّیٰ کیا تھا یہ سارا مواد عربی کتابوں میں منتشر طور پر موجود ہے۔ اس بکھرے ہوئے مواد کو استعمال کرنے اور اسلامیات کی مفصل تاریخ لکھنے کا فرض ہماری نسل پر واجب ہی نہیں فرض ہے۔ مغربی زبانوں میں اسلامیات کے متعلق جو اہم کام ہوئے ہیں مگر مغرب میں اسلامیات سے متعلق چھوٹے سے چھوٹا مضمون بھی ایسا شائع نہیں ہوتا جس کی بنیاد نسلی عناد اور مغربی برتری کے مضبوط یقین پر استوار نہ ہو۔

گزشتہ سو سال میں اسلامی تاریخ و تہذیب کے بارے میں اہم ترین کتابیں کتب خانوں کے گوشہ گمنامی سے نکل کے منظر عام پر آچکی ہیں اور عربی مآخذات سے استفادہ کرسکنے والے حلقے کے لئے وسیع ترین معلومات کا ذخیرہ وجود میں آچکا ہے ضرورت صرف احساس اور جذبۂ عمل کی ہے۔

وما توفیقی الّا باللہ

عربی ماخذات

اس کتابیات میں پہلے ان عربی ماخذات کی ایک فہرست دیدی گئی ہے جو سرسری طور پر مطالعہ اسلامیات کیلئے اہم مواد کی فراہمی کے قابل محسوس ہوئے۔ ذراسی تلاش سے ماخذات کی یہ فہرست اور بڑھائی جاسکتی ہے۔ عربی جاننے والے حلقے کے لئے تلاش و تحقیق، تصنیف و تبلیغ کا ایک بڑا میدان کھلا ہوا ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ دیں۔

تاریخ توسیع و سلطنت اسلامیہ

کتاب	مصنف
سیرت الرسول	محمد بن اسحاق
کتاب المغازی	موسیٰ بن عقبہ
طبقات ابن سعد	ابن سعد
اصابہ فی الاحوال الصحابہ	ابن حجر عسقلانی
کتاب التابعین	معتمد الواقدی
فتوح المصر	ابن الحکم المصری
کتاب المعارف	ابو مسلم دینوری
اخبار الطوال	ابو حنیفہ دینوری
تاریخ الامم	ابن جریر طبری
التنبیہ و الاشراف	ابوالحسن المسعودی
تاریخ الکبیر	ابوالقاسم بن عساکر
کتاب المنتظم	ابن جوزی
تاریخ الکامل	ابن اثیر
مراۃ الزماں	سبط الجوزی
کتاب العبر	ابن خلدون
البدایہ والنہایہ	ابن کثیر
دول الاسلام	شمس الدین ذہبی
تاریخ غرناطہ	ابن الخطیب
تاریخ البغداد	عبداللطیف بغدادی
نفح الطیب	المقری تلمسانی
المختصر	اسماعیل بن علی ابوالفدا
القبایل وایام الکبیر	محمد بن حبیب
نسب القریش واخبارہم	الزبیر بن بکار
اخبار المکہ	الازرقی
کتاب الوزرا	ہلال الصابی

شفا العلیل — شمس الدین خفاجی
فریدۃ العصر — عماد الدین اصفہانی
تاریخ الیمن — عمارۃ الیمنی
تاریخ الخلفا — جلال الدین سیوطی

عمرانیات

کتاب البر واثم — بوعلی سینا
آرار مدینہ الفاضلہ — ابو نصر فارابی
زریعہ الی المکارم الشریعہ — امام راغب اصفہانی
اخلاق الملوک — عمر بن عثمان الجاحظ
امامۃ والسیاستہ — ابن قتیبہ
احکام السلطانیہ — ابوالحسن الماوردی
کتاب الخراج — امام ابو یوسف
سلوک الملوک — ابن ابی الربیع
تجارب الامم — ابن سکویہ
تہذیب الاخلاق — ”
قوۃ القلوب — ابو طالب المکی
تدبیر المتوحد — ابن باجہ
حیوٰۃ المعتزل — ”
احیائے العلوم — امام غزالی
حجۃ اللہ البالغہ — شاہ ولی اللہ
رسالہ قلیشریہ — ابوالقاسم القشیری
شرح السیر الکبیر — شمس الائمہ السرخسی
اخلاق ناصری — خواجہ نصیر الدین الطوسی

تمدن و تہذیب

صبح الاعشا — ابن علی قلشقندی
المستطرف — ابن احمد الشبیہی
نشوان المحاضرہ — ابو علی تنوخی
الفرج بعد الشرق — ”
الخطط والآثار — تقی الدین المقریزی
حلیۃ الکمیت — محمد بن حسن النواجی
غرر الخصایص — جمال الدین وطواط
مطالع البدور — علی بن عبداللہ البہائی
سفرنامہ سلیمان — ابو زید الحسن
فتوح البلدان — ابن یحییٰ البلاذری
اشکال البلاد — ابن حوقل
المسالیک والممالیک — ابن خردادبہ
نزہت المشتاق — ابو عبداللہ ادریسی
تقویم البلدان — ابو الفدا الحموی

عجائب الاسفار	ابن بطوطہ
المسالیک الممالیک	ابو عبداللہ البکری
علایق نفیسہ	ابن رستہ
سفر نامہ	حکیم ناصر خسرو
مروج الذہب	ابوالحسن المسعودی
نزہت القلوب	حمداللہ المستوفی
المسالک الابصار	ابن فضل اللہ العمری
آثار البلاد	ابن محمد القزوینی
معرفۃ الاقالیم	ابن احمد المقدسی
المسالیک والممالیک	ابو اسحاق اسطخری
آثار البلاد	ابو ریحان البیرونی

ادبِ عالیہ

المفضلیات	المفضل الضبی
امثال العرب	"
الحماسہ	ابو تمام
الحماسہ	ابو عبادہ البحتری
عقد الفرید	ابن عبد ربہ
الآمالی	ابو علی القالی
اخبار العرب	المطرز البادردی
کتاب العمدہ	ابن اثیق
یتیمات الدہر	ابو منصور الثعالبی
اللزومیات	ابوالعلا المعری
المقامات	بدیع الزماں ہمدانی
المقامات	ابو محمد قاسم الحریری
جمہرۃ الاشعار	ابو زید القریشی
جامع الکبیر	ضیاء الدین ابن اثیر
المغنی اللبیب	جلال الدین ابن ہشام
الشعر والشعرا	ابن قتیبہ
نقد الشعر	قدامہ بن جعفر
نقد النثر	"
کتاب الاغانی	ابو الفرج اصفہانی
مجمع الامثال	المیدانی
لسان العرب	ابن المنظور
مفتاح العلوم	السکاکی
داستان عنترہ	امام اصمعی
الف لیلہ	×
ادب الکاتب	ابن قتیبہ

لسانیات

کتاب العین	خلیل بن احمد
کتاب المعانی	مورخ السدوسی
الاضداد	ابن ستیز القطرب
النحو	ابو بشر سیبویہ
الھجار	ابو الحسن الکسائی
المعانی	ابو ذکرا الفرآ
الجمہرہ فی اللغت	ابو بکر ابن درید
المحیط	صاحب بن عباد
المجمل	ابن الفارس الرازی
الصحاح	اسماعیل الجوہری
المحکم	علی ابن سیدہ
القاموس المحیط	مجد الدین فیروز آبادی
تاج العروس	مرتضیٰ الزبیدی
الکافیہ	ابن الحاجب
الشافیہ	״
الکامل	المبرد
بیان والتبیین	عمر بن عثمان الجاحظ
لسان العرب	ابو الفضل ابن جمال الدین

مجمع البحرین	الصنعانی

تاریخ علماء و علوم

کتاب الفہرست	اسحاق بن الندیم
طبقات الامم	صاعد بن احمد
وفیات الاعیان	ابن خلکان
معجم الادبا	ابن عبداللہ حموی
عیون الانبا	ابن ابی اصیبعہ
کتاب الصلہ	ابن بشکوال
تاریخ الاطبا	ابن جلجل
تاریخ علماء اندلس	ابن فرضی
الوافی فی الوفیات	صلاح الدین الصفدی
اخبار الحکما	جمال الدین ابن قفطی
طبقات الحفاظ	شمس الدین ذہبی
طبقات الادبا	کمال الدین الانباری
محاضرات الادبا	راغب اصفہانی
عیون الاخبار	ابن قتیبہ
نہایت العرب	ابن عبدالوہاب النویری
کشف الظنون	حاجی خلیفہ
مفتاح السعادۃ	طاش کبری زادہ

کتاب	مصنف
کشاف الاصطلاحات	محمد التھانوی
ابجد العلوم	صدیق حسن قنوجی
کتاب الفوائد	اسد البحر ابن ماجد
بحریہ	امیر البحر پیری پاشا
کشکول	بہاء الدین العاملی
نزہۃ الخواطر	مولانا عبدالحئی

مزید مطالعے کے لئے

زیرِ نظر کتاب کے ہر باب سے متعلق مواد فراہم کرنے والی ان اُردو کتابوں کی ایک امدادی فہرست دی جارہی ہے جو علمی اور تحقیقی اعتبار سے مستند اور عام فہم طریقے پر لکھی گئی ہیں۔ یہ اُردو کی وہ کتابیں ہیں جو بآسانی دستیاب ہوسکتی ہیں۔ ان کے مطالعے کی پُرزور سفارش کی جاتی ہے۔

تہذیب وسلطنت کا عروج

کتاب	مصنف
تمدن عرب	سید علی بلگرامی
تاریخ اسلام	معین الدین ندوی
تاریخ الامت	اسلم جیراجپوری
عبرت نامۂ اندلس	عنایت اللہ دہلوی
اعظم الکلام	مولوی چراغ علی
تاریخ اسلام	سید امیر علی
تاریخ صقلیہ	ریاست علی ندوی
حکمائے اسلام کے کارنامے	عبدالرحمن خاں
تاریخ اسلام	احسان اللہ عباسی
تہذیب وتمدن اسلامی	رشید اختر ندوی
اسلامی فن تعمیر	مبارز الدین رفعت
مسلمانوں کا نظم مملکت	ڈاکٹر حسن ابراہیم
اسلامی تہذیب	محمد مارماڈیوک پکتھال
اسلام اور عربی تمدن	علامہ کرد علی
ترجمہ تاریخ ابن خلدون	علامہ احمد حسین الٰہ آبادی
ترجمہ تاریخ ابن اثیر	سید ابوالخیر مودودی
ترجمہ تاریخ طبری	سید محمد ابراہیم
ترجمہ تاریخ بیہقی	خدا علی طالب
" تاریخ فرشتہ	"

مسلمانوں کے زوال سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا	ابوالحسن علی ندوی
اخبار الاندلس	مولوی خلیل الرحمن
سفرنامہ اندلس	قاری ولی محمد
سفرنامہ مصر	قاری ولی محمد
مغرب الاقصیٰ	جمیل الرحمان

الکتاب اللہ

تدبر قرآن	امین احسن اصلاحی
تدوین قرآن	غلام ربانی ایم اے
مقالات قرآنی	عبداللہ العمادی
تاریخ القرآن	مولانا محمد اسلم جیراجپوری
البیان فی علوم القرآن	شاہ عبدالحق محدث دہلوی
وحی الٰہی	مولانا سعید احمد ایم اے
قرآن اور تعمیر سیرت	ڈاکٹر میر ولی الدین ایم اے
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	سید ابوالاعلیٰ مودودی
فہم قرآن	مولانا سعید احمد ایم اے
قرآنی فیصلے	غلام احمد پرویز
تفسیر احمدیہ	سرسید احمد خاں
تفسیر سورہ فاتحہ	ابوالکلام آزاد

الرسول اللہ

سیرۃ النبی	مولانا شبلی نعمانی
نشر الطیب	مولانا اشرف علی
عہد نبوی میں نظام حکومت	ڈاکٹر حمید اللہ
خطبات احمدیہ	سرسید احمد خاں
رحمۃ للعالمین	قاضی محمد سلیمان سلمان
خطبات مدراس	سید سلیمان ندوی
اصح السیر	مولانا عبدالرؤف داناپوری
حدیث دفاع	میجر جنرل محمد اکبر خاں
رسول پاک کی سیاسی زندگی	ڈاکٹر حمید اللہ
حیات محمد (ترجمہ اردو)	محمد حسین ہیکل
تیغ نبوی اور مستشرقین (ترجمہ اردو)	ولہاوزن
سید الانبیاء (ترجمہ اردو)	کارلائل
مدارج النبوۃ	شاہ عبدالحق محدث دہلوی

احکام القرآن

فوز الکبیر	شاہ ولی اللہ
البیان فی علوم القرآن	عبدالحق حقانی
قرآنی دعوت انقلاب	مولانا محمد علی لاہوری
معاشیات اسلامی	محمد یوسف

الجہاد فی الاسلام — ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کا نظام سیاست و عدالت — شیخ حسن البنا

اسلام کا معاشی نظریہ — مظہر الدین صدیقی

قرآنی دستور انقلاب — مولانا عبیداللہ سندھی

اسلام اور سائنس — مولانا اشرف علی

تحقیق الجہاد — مولوی چراغ علی

حدیث وسنت

تدوین حدیث — مولانا مناظر حسن گیلانی

ترجمان السنۃ — مولانا بدر عالم

تاریخ اہل حدیث — مولانا ابراہیم

دو اسلام — غلام جیلانی برق

مطالعۂ حدیث — سید مقبول احمد

معارف الحدیث — مولانا منظور نعمانی

مقام سنت — مولانا جعفر ندوی

بستان المحدثین — شاہ عبدالعزیز دہلوی

ایضاح الادلہ — مولانا محمود الحسن

امام مالک — سید سلیمان ندوی

قانون کا ارتقا

تاریخ فقہ اسلامی — عبدالسلام ندوی

اسلامی قانون — سید ابوالاعلیٰ مودودی

فقہ عمر — ابو یحییٰ امام خاں

تاریخ علم فقہ — مفتی عمیم الاحسان

سیرت آئمہ اربعہ — رئیس احمد جعفری

امام اعظم — شبلی نعمانی

سیرت شافعی — مولانا خالد بھوپالی

تابعین — عبدالسلام ندوی

علم الفقہ — مولانا عبدالشکور لکھنوی

تقلید عمل بالحدیث — محسن الملک

المعتزلہ

تاریخ دعوت و عزیمت — ابوالحسن علی ندوی

الغزالی — شبلی نعمانی

ابن رشد — مولوی یونس انصاری

الکلام — شبلی نعمانی

حکمائے اسلام — عبدالسلام ندوی

علمائے سلف — صدر یار جنگ

فلسفۃ الاسلام — مجتہد العصر سید محمد لکھنوی

مسلمانوں کا نظام تعلیم — مناظر احسن گیلانی

امام رازی — عبدالسلام ندوی

افکار و سیاسیات اسلامی	عبدالوحید

تین فرقے

مذاہب الاسلام	نجم الغنی رامپوری
تحفۂ اثنا عشریہ	شاہ عبدالعزیز
فرقہ بندیوں کا افسانہ	مناظر احسن گیلانی
آیات بینات	محسن الملک
علوی تصورات	اختر علی تلہری
الفرق	عابد علی قزلباش
امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی	مناظر احسن گیلانی
امہات المومنین	نذیر احمد دہلوی
کتاب شہادت	مرزا حیرت دہلوی
دلائل الخلافت	مولانا عبدالشکور لکھنوی
ذبح العظیم	اولاد حیدر فوق بلگرامی
المعاویہ	عمر ابوالنصر

زہد و اتقا کا نظریہ

تاریخ حریت اسلام	محمد الدین فوق
تاریخ مشائخ چشت	خلیق احمد نظامی
تصوف کیا ہے	مولانا منظور نعمانی
تصوف اور اسلام	عبدالماجد دریابادی

مسایل السلوک	مولانا اشرف علی
عمر ابن عبدالعزیز	عبدالسلام ندوی
اسوۂ صحابہ	"
تذکرۃ الاولیا	فریدالدین عطار
حکیم الامت	عبدالماجد دریابادی

صوفی تحریک

التکشف	مولانا اشرف علی
غنیۃ الطالبین	سید عبدالقادر جیلانی
تصوف اور اسلام	عبدالماجد دریابادی
روح تصوف	سید محمد گیسو دراز
فوایدالفواید	نظام الدین اولیا
تجدید تصوف و سلوک	عبدالباری ندوی
بزم صوفیہ	صباح الدین عبدالرحمان
الحکم الرفاعیہ	عبدالحلیم شرر

نشاۃ ثانیہ کی لہر

اسباب زوال امت	امیر شکیب ارسلان
تذکرہ شاہ ولی اللہ	مناظر احسن گیلانی
تجدید و احیائے دین	مولانا ابوالاعلی مودودی
محمد بن عبدالوہاب	مسعود عالم ندوی

کتاب	مصنف
تذکیرہ الاخوان	مولانا اسمٰعیل شہید
آثار جمال الدین افغانی	قاضی عبدالغفار
ہندستانی مسلمان	ڈاکٹر ولیم ہنٹر
سیرت محمد علی	رئیس احمد جعفری
تاریخ جنوبی ہند	محمود بنگلوری
علمائے ہند کا شاندار ماضی	مولانا محمد میاں
مستقبل اسلام	پروفیسر وسیبری
مآثر صدیقی	نواب صدیق حسن خاں
ہندستانی مسلمانوں کی بیداری	
مسلمانوں کا روشن مستقبل	سید طفیل احمد
سیرت سید احمد شہید	غلام رسول مہر
سوانح احمدی	محمد جعفر تھانیسری
تہذیب الاخلاق	سر سید احمد خاں
تاریخ التعلیم	سید محمود
حیات جاوید	الطاف حسین حالی
مضامین اقبال	ڈاکٹر محمد اقبال
حیات سر سید	الطاف حسین حالی
مکتوبات شاہ ولی اللہ	خلیق احمد نظامی
مضامین الہلال	ابوالکلام آزاد
مسلم ثقافت ہندستان میں	عبدالمجید سالک
شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات	مولانا احتشام الحق
بہادر شاہ ظفر اور انکا عہد	رئیس احمد جعفری
سرگزشت مجاہدین	غلام رسول مہر
۱۸۵۷ کے مجاہد	غلام رسول مہر
سوانح قاسمی	مناظر احسن گیلانی
علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں	انتظام اللہ شہابی

ختم شد

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	درست
۱۹	۱۶	سنہ ۱۶۹۳	سنہ ۱۱۹۳ع
۲۹	۷	میدانواں	میدانوں
۴۰	۶	آخر	اکثر
۹۱	۷	تسلیم نہ کرتے	تسلیم تو کرتے
۹۲	۶	یادوں پر	یادوں کے
۱۱۴	۵	خلافت کا مل جانا	خلافت کا حق مل خانا
۱۲۱	۱۶	ان کے معتقدین	انکے معتقدین انکو یمن
۱۲۲	۱	التموت	الموت
۱۲۲	۵	جو	یہہ
۱۳۲	۱	سات رسالے	چار رسالے
۱۳۷	۴	نصوص الحکم	فصوص الحکم
۱۳۹	۳	کے رجحان	کے اس ذھنی رجحان
۱۶۴	۸	ایران کی	ھمسایہ ایران کي
۱۶۸	۵	سنہ ۱۸۷۶ع	سنہ ۱۸۶۴ع
۱۶۸	۱۶	سنہ ۱۹۵۸ع	سنہ ۱۸۵۸ع
۱۶۹	۱۶	خلاف ناموں	حلف ناموں
۱۷۰	۸	بم باری	گولہ باري
۱۹۰	۸	الجبہرہ	الجمہرہ
۱۹۱	۷	جو	کافی
۱۹۵	۱۸	الحاجظ	الجاحظ